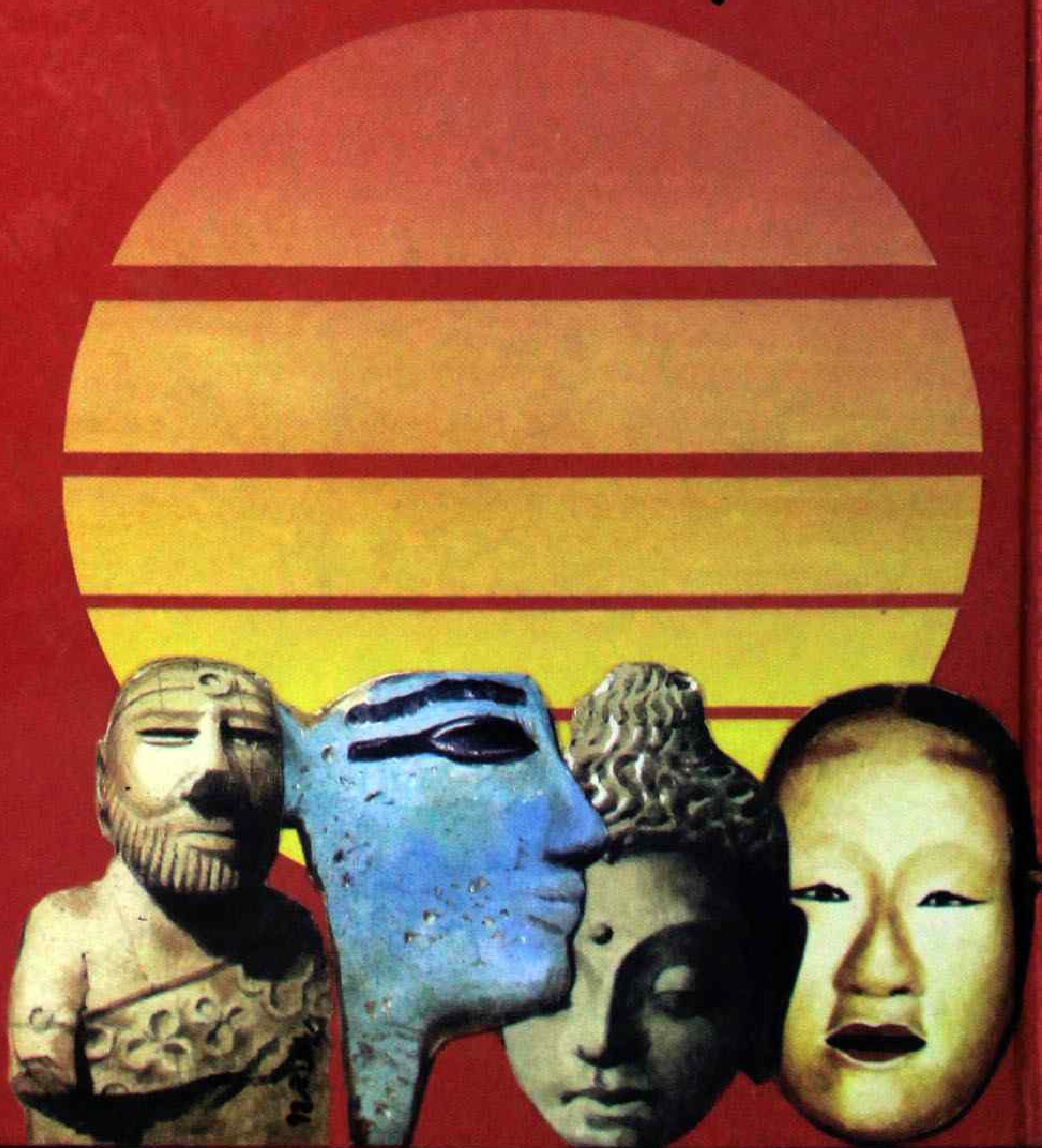
فلسفہ عروج و زوال اقوام

لیبان ترجمہ: مولانا عبدالسلام ندوی



فلسفہ

عروج و زوال اقوام

مصنف : ڈاکٹر لیبان

ترجمہ : مولانا عبدالسلام ندوی



اکرم آرکیڈ، ۲۹ ٹمپل روڈ (صفاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۴

ناشر : تخلیقات
اہتمام : لیاقت علی
ڈیزائن : ریاظ
پرنٹرز : اے-این-اے پرنٹرز
سن اشاعت : 1998ء
قیمت : 120 روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد اللہ الذ ی الیہ المرجع الماب۔ والصلوۃ علی رسولہ وآلہ والاصحاب

مغربی خیالات کی ترجمانی کا حق اگرچہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔ لیکن ہم قبتہ الاسلام مصر کے ممنون ہیں جس کی کوششوں نے عربی دان جماعت کو بھی ایک حد تک ان خیالات کی واقفیت کا موقع دیا ہے۔

اس وقت جو کتاب آپ کے سامنے ہے وہ بھی دریائے نیل کی ایک لہر ہے۔ موسیو گستاؤلی بان' جو تمدن عرب اور تمدن ہند کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں ہیں' ان کی ایک فرنچ کتاب کے عربی ترجمہ کو ہم نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ جس کا اصل نام

Law Pcychologeg Uisdel Evolution Despeuples

یعنی "قوموں کی ترقی و تنزل کے نفسی قوانین" ہے جس میں ان نفسی اصول اور اخلاقی قوانین کی تشریح کی گئی ہے جن کے ساتھ اقوام عالم کی ترقی و تنزل وابستہ ہے۔ جس طرح ہر شخص میں ایک مخصوص روح ہوتی ہے جس کے مطابق وہ اپنے تمام ذاتی کام انجام دیتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم کے قالب میں بھی ایک خاص روح ہوتی ہے اس کے مخصوص اخلاق اور خواص ہوتے ہیں جو درحقیقت اس قوم کی تمام حرکات ترقی و تنزل کا محور ہیں۔ یہ کتاب اسی قومی روح کی جلوہ طرازیوں کا مظہر ہے۔ آج کل جبکہ تمام دنیا میں ایک عام قومی کش کمش برپا ہے

جبکہ ہندوستان اپنی قومی تاروپود کو مستحکم کررہا ہے۔ جبکہ فرزندان اسلام اپنی بربادی کے ماتم سے فارغ ہوکر آئندہ ترقی کے لئے شاہراہ عمل کی تجویز میں مصروف ہیں' امید ہے کہ یہ کتاب ان کے خیالات کی توسیع میں بہت کچھ مدد دے گی۔ **وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔**

سوانح مصنف

موسیولی بان

بیسویں صدی کے فرزندانِ علم میں یورپ بلکہ کل مہذب دنیا جن لوگوں کی ذات پر ناز کرتی ہے ان میں ایک ڈاکٹر لیبان (۱) بھی ہے۔

ولادت اور خاندان:۔ برگنڈی اور برٹینی فرانس کے دو مشہور صوبے ہیں۔ لیبان کا خاندان انہی صوبوں سے تعلق رکھتا ہے۔ سیف و قلم دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور دنیا میں ایسے خوش قسمت بہت کم ہوئے ہیں جن کے ہاتھ میں یہ دونوں چیزیں نظر آئیں۔ لیکن لیبان اس حیثیت سے نہایت خوش نصیب ہے کہ اس کے آباؤ اجداد میں یہ دونوں جوہر نظر آتے ہیں۔

لیبان مضافات پیرس میں بہ مقام نوژان لے رُدلو'رو۔ غالباً" ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا۔

تعلیم و تربیت:۔ اور پیرس کے قریب تورس کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ لیبان اس وقت جس قدر مشہور ہے اسی قدر زمانہ طالب العلمی میں گمنام رہا۔ اس کا شمار کبھی اسکول کے اچھے طلباء میں نہیں ہوا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کبھی کورس کی کتابوں میں دل نہیں لگاتا تھا۔ زمانہ طالب العلمی میں اس کی انتہائی کامیابی صرف یہ تھی کہ پاس ہوجاتا تھا۔ ورنہ اس کو امتحانات میں اچھے نمبر کبھی نہیں ملے۔ کالج میں بھی یہی حال رہا: تاہم بایں ہمہ اس نے طب میں ڈاکٹری (ایم۔ ڈی) کی ڈگری حاصل کی۔

سیرو سیاحت:۔ لیبان کی زندگی کی ایک خاص خصوصیت سیاحی ہے۔ اس

نے انگلستان۔ روس۔ اٹلی۔ پولینڈ اور اسپین کی خوب سیاحت کی ہے۔ مراکو۔ فلسطین۔ اور مصر بھی ہو آیا ہے۔ وہ ایک خاص حیثیت سے ہندوستان کا بھی سفر کرچکا ہے یعنی خود فرنچ گورنمنٹ نے اس کو ایک سائنٹفک کمیشن پر ہندوستان بھیجا تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے نیپال کی بھی سیر کی۔ اور وہ پہلا فرنچ شخص تھا جس نے سرزمین نیپال پر قدم رکھا۔

لیکن لیبان کے سفر کا مقصد اکثر یورپین سیاحوں کی طرح سیر و تفریح نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس نے اپنی طویل سیاحت میں نہایت دقیق علمی تجارب حاصل کئے ہیں۔ مذہب۔ تمدن اور آثار قدیمہ کے متعلق نہایت مفید تحقیقات کی ہیں۔ قوموں کی نفسیات کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ نیپال کی سیاحت کے زمانہ میں وہ ان آثار قدیمہ کے فوٹو لے کر فرانس بھیجتا تھا جن کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ انہی آثار قدیمہ کی شہادت سے اس نے ثابت کیا ہے کہ بودھ مذہب اگرچہ ابتدا میں ہندو مذہب سے بالکل علیحدہ و مختلف ایک مستقل مذہب تھالیکن کچھ دنوں کے بعد وہ ہندو مذہب کے اندر جذب ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلی ہندو مذہب اور بودھ مذہب دونوں کی خالص تعلیمات فنا ہوگئیں۔ اور دونوں کی آمیزش اور تاثیر و تاثر سے مذہب کی ایک جدید شکل قائم ہوگئی۔

مشرق کے مختلف تمدنوں پر اس نے جو محققانہ کتابیں لکھی ہیں' اُن کی بنیاد زیادہ تر انہی ذاتی مشاہدات پر ہے۔ خود لیبان کی تصنیفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نفسیات اور خصائص قومیہ کے مطالعہ کے لئے سفر کو کس قدر ضروری چیز خیال کرتا ہے۔

اخلاق و عادات:۔ لیبان کے اخلاق و عادات بالکل حکیمانہ ہیں۔ اکثر خاموش رہتا ہے۔ خلوت گزینی اور غور و فکر کا عادی ہے۔ لوگوں سے زیادہ ملنے جلنے کو سخت ناپسند کرتا ہے' اس لئے بعض لوگ اس کو مغرور اور خود پسند خیال کرتے ہیں 'لیکن اس کے ساتھ اس کو بحث و استدلال بہت پسند ہے۔ بچپن سے ہر بات پر رد و قدح کرنے کا شائق ہے۔ مزاج میں استقلال۔ ضد۔ اور ہٹ دھرمی کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔

حلیہ:۔ لیبان کی شکل و شباہت بالکل برگنڈی کے باشندوں کے مشابہ ہے۔ آنکھیں سیاہ' بال کالے۔ اور گھونگر والے ہیں۔ رنگ بھی یورپین لوگوں کے لحاظ سے کسی قدر تاریکی مائل ہے' قد دراز۔ سر گول۔ پیشانی چوڑی اور اونچی ہے۔

شادی:۔ لیبان کو چونکہ سوشل رسم و رواج سے سخت نفرت ہے اس لئے اس نے شادی نہیں کی البتہ اس کا ایک مشہور مصنفہ سے مدتوں دوستانہ تعلق رہا۔

شہرت:۔ عالم مثال کی صورو اشباح اگرچہ بذات خود آفتاب کی طرح روشن ہیں' لیکن خواص کے سوا عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں۔ لیبان کی شہرت اور گمنامی کا بھی یہی حال ہے۔ اعلی ترین علمی حلقوں میں اس کو جو امتیاز حاصل ہے' وہ یورپ بھر میں کسی مصنف کو نصیب نہیں۔ اس کی متعدد تصانیف کا جرمن' انگریزی' روسی' اسپینی' اٹالین' عربی اور اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے اور خود فرنچ میں اس کی اکثر تصنیفات کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ عام مقبولیت کے لحاظ سے تمام یورپ میں کوئی مصنف اس سے زیادہ گمنام اور خامل الذکر نہیں نہ اخبارات میں اس کا کہیں نام آتا ہے نہ رسالے اس سے مضامین لیتے ہیں۔ نہ وہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسر ہے۔ یہاں تک کہ اس کے حالات بھی کہیں نہیں ملتے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے آخری ایڈیشن سے زیادہ جامع اور ضخیم کوئی کتاب نہ ہوگی۔ لیکن ایسی ضخیم کتاب میں لیبان کا ضمنی اور اتفاقی طور پر بھی کہیں ذکر نہیں آیا ہے۔

اس موقع پر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدم شہرت کے اسباب کیا ہیں؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تو خود لیبان کی تصنیفات دے سکتی ہیں۔ اصولاً صرف اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ اس کے نظریات بالکل مجتہدانہ اور اکثر صورتوں میں معاصر علماء بلکہ کل دنیا کے معتقدات و مسلمات کے خلاف ہوتے ہیں۔ مثلاً آج کل یورپ میں جمہوریت کی عام گرم بازاری ہے۔ بالخصوص فرانس میں تو اس کے خلاف ایک حرف بھی کہنا کفر ہے۔ لیکن لیبان اپنی تصنیفات میں عموماً جمہوریت کے نقائص کی پردہ دری کرتا ہے۔ اور اس کو حکومت کی سب سے

زیادہ مستبدانہ صورت قرار دیتا ہے۔ پبلک رائے۔ اور اجتماعی قوت اس زمانے میں سب سے زیادہ موثر چیز ہیں۔ لیکن لیبان کے نزدیک وہ جنون و سفاہت کا مظہر ہیں۔ اشتراکیت۔ مساوات حریت اور آزادی موجودہ لٹریچر کے نہایت متداول الفاظ ہیں۔ اور ان کا اثر انسان کے رگ و پے سے متعدی ہوکر آب و ہوا تک میں سرایت کرگیا ہے۔ لیکن لیبان کے نزدیک اشتراکیت' تمدن کے زوال کا پیش خیمہ۔ قوموں کی جدوجہد اور عزم و استقلال کی بیخ کن ہے۔ مساوات خلاف فطرت۔ اور دور وحشت کی یادگار ہے۔ آزادی اور حریت جنون کا مقدمہ ہے۔ تمدنی اور اخلاقی حیثیت سے اگرچہ وہ مذہب کے اثر کا معترف ہے۔ لیکن اعتقادا" اس کو توہمات و خرافات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ تاریخ سب سے زیادہ مستند چیز سمجھی جاتی ہے۔ لیکن وہ اس کو تقویم کہن و افسانہ پارینہ خیال کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو پبلک سے قدردانی کی کیا توقع ہوسکتی ہے؟ اس کی عدم مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں شہرت کا زیادہ تر دارمدار نمائشی اعزازات و خطابات پر ہے اور لیبان اس شرف سے بالکل بے بہرہ ہے۔ وہ بالکل ایک خود ساختہ آدمی ہے۔ کسی یونیورسٹی یا کالج کا پروردہ نہیں۔ اس نے کسی یونیورسٹی سے ڈگری نہیں حاصل کی۔ اس بناء پر اس زمانے کے ذرائع شہرت سے بالکل محروم ہے۔

تصنیفات:۔ متفرق مضامین کے علاوہ لیبان کی مستقل تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) سفرنامہ کوہ قطراس

(۲) سفرنامہ نیپال

(۳) سوسائٹی کا ارتقاء

(۴) مشرق کے ابتدائی تمدن ـــــ یہ مصر۔ شام اور یہودیوں کے تمدن کی تاریخ ہے

(۵) آثار قدیمہ

(۶) نفسیات اشتراکیت

(۷) نفسیات تعلیم

(۸) نفسیات انقلاب فرانس

(۹) تمباکو کے کیمیائی اجزاء

(۱۰) الحیات ـــــــ علم افعال الاعضاء پر ہے

(۱۱) ارتقائے مادہ ـــــــ طبعیات پر محققانہ کتاب ہے

(۱۲) ارتقائے قوت

(۱۳) فن شہسواری کے سائنٹفک اصول و تجربات

(۱۴) فن فوٹوگرافی پر سائنٹفک رسالہ

(۱۵) مجموعہ مضامین متعلق بہ طبعیات

(۱۶) نفسیات اجتماع ـــ اس کا ترجمہ احمد فتحی زغلول پاشا نے عربی میں کردیا ہے اور وہ مصر میں چھپ گیا ہے جس کا عربی نام "روح الاجتماع" ہے۔

(۱۷) تمدن ہند مولوی سید علی بلگرامی مرحوم نے اردو میں اس کا ترجمہ کردیا ہے۔

(۱۸) تمدن عرب ایضاً"

(۱۹) ارتقاء اقوام کے قوانین نفسی۔ یہی اخیر کتاب ہے جس کا ترجمہ مصر کے مشہور مترجم احمد فتحی زغلول پاشا نے عربی زبان میں "سرتطورالامم" کے نام سے کیا ہے۔ اور ہم اسی عربی ترجمہ کو اردو کے قالب میں ڈھال کر ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی عزت حاصل کررہے ہیں۔

عبدالسلام۔ ندوی
دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

حاشیہ

(۱) ان حالات کو ہمارے دوست مولوی عبدالماجد بی۔ اے۔ نے لیبان کی ایک مختصر سوانح عمری سے جو فرنچ میں لکھی گئی ہے مرتب کیا ہے جس کو ہم نے خفیف تغیر کے ساتھ انہی کے الفاظ میں درج کردیا ہے۔

مقدمہ
از
مترجم

فلسفہ عروج و زوال اقوام
اور
اسلام و علمائے اسلام

علم و مذہب۔ تہذیب و تمدن۔ ملک و سلطنت۔ ہر مذہب قوم کا سرمایہ حیات ہیں۔ اور انھیں چیزوں کی ترکیب و امتزاج سے ہر قوم کا تاریخی مواد تیار ہوتا ہے۔ اس بناء پر ہر متمدن قوم اپنا تاریخی سرمایہ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اور اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اس کو محفوظ رکھتی ہے۔ وہ اپنے مواد کی تیاری اور پختگی میں کسی مورخ کی ممنون احسان نہیں ہوتی۔ بلکہ خود مورخ اس قوم کا گرانبار منت ہوتا ہے۔ البتہ اس مواد کی موزوں ترتیب اس کا مکمل نظام۔ اور اس کے ابتدائی اور انتہائی سلسلوں میں توفیق و تطبیق۔ غرض اس کے تمام ارتقائی مدارج کی تفصیل و توضیح ایک مورخ کا کام ہے۔ اور اس حیثیت سے تاریخ کی نہایت سادہ، مختصر، عام فہم اور جامع تعریف مجموعہ ارتقاء۔ "اقوام کی ترکیب اضافی کے ساتھ کی جاسکتی ہے جو لیبان کی کتاب کا نام کا پہلا جزو ہے۔ لیکن یہ جزو اس کتاب کی ایک جنس مشترک ہے جو تاریخ کی ہر کتاب پر صادق آسکتی ہے۔ کتاب کی فصل ممیز جو اس کو تمام تاریخی کتابوں سے ممتاز کرتی ہے

اس کا دوسرا جزو یعنی ارتقاء اقوام کے قوانین نفسی" ہے۔ اور انہی قوانین کی تفصیل اس کتاب کا موضوع اور لیبان کا اصلی کارنامہ ہے۔

جدید علمی دور میں جن علوم و فنون نے ترقی کی ہے' ان میں علم النفس (سائیکالوجی) سب سے زیادہ دلچسپ اور اپنے موضوع کے لحاظ سے اعلیٰ و اشرف ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو علم علمی ترتیب و تقسیم کے لحاظ سے فلسفہ الٰہیات کے سلسلہ میں داخل ہے وہ صرف اعلیٰ اور دلچسپ ہی ہوسکتا ہے۔ اس سے عام طور پر کوئی عملی کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس بناء پر یورپ کی عالمگیر قوت تسخیر نے بھی اس دلچسپ علم کو ہمیشہ اپنے دائرہ عمل سے باہر رکھا۔ لیکن لیبان پہلا شخص ہے جس نے اس سے اجتماعی۔ تمدنی۔ تعلیمی۔ اور تاریخی مباحث میں کام لیا۔ اور اس خوبی کے ساتھ لیا کہ ان مباحث نے ایک جدید فلسفیانہ قالب اختیار کرلیا۔ چنانچہ اس کی تصنیفات کی طویل فہرست میں نفسیات اجتماع۔ نفسیات اشتراکیت۔ نفسیات انقلاب فرانس۔ نفسیات تعلیم۔ سرتطورالامم۔ اس کے اس کارنامہ زریں کو نہایت آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کررہی ہیں۔ لیکن اس موقع پر خودبخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس رنگ کی جھلک اور بھی کہیں نظر آسکتی ہے؟ صرف لیبان ہی اس کا موجد ہے ہم کو خود کچھ نہیں معلوم۔ لیکن علماء یورپ میں جن لوگوں نے اس عقدہ کو حل کیا ہے ان میں لیبان نے صرف دو شخصوں کا نام لیا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر لکھتا ہے۔

"علم النفس کے علماء نے اپنی تحقیقات کو صرف عقلی مسائل تک محدود کردیا ہے اور اخلاقی مباحث کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ میری دانست میں صرف موسیو پولہان نے رسالہ اخلاق میں اخلاق کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ صرف اخلاق ہی قوموں کے مزاج عقلی کو پیدا کرسکتا ہے۔ ایک اور عالم موسیو ریبو نے بھی چند اوراق میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عقلی انقلابات میں ذہانت دوسرے درجہ کا انقلاب ہے۔ اصلی سنگ بنیاد صرف اخلاق ہے۔ جب عقل غیر معمولی نشوونما حاصل کرلیتی ہے تو اکثر اخلاق کو فنا کردیتی ہے"۔

اس بناء پر نفسی قوموں کی بحث اور ان کے باہمی مقابلہ میں ہمیشہ اخلاق کو پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ علم الاخلاق کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہر قوم کی تاریخ کا ماخذ ہے۔اس سے ہر قوم کے مدبرین کو راہ ہدایت ملتی ہے۔ اور اگر یہ مشکل نہ ہوتی کہ وہ کارخانوں میں اور کتابوں کے اوراق میں نہیں ملتا بلکہ اس کی تحقیق کے لئے دفتر کے دفتر الٹنے پڑتے ہیں اور مختلف قوموں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ تو درحقیقت یہ نہایت عجیب بات ہوتی کہ علماء نے آج تک اس فن کو مدون نہیں کیا اور ہم کو علم النفس کے مصنفین جدید میں کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جس نے اس کی مزاولت کی ہو کیونکہ اب وہ تمام مباحث کو چھوڑ کر صرف علم تشریح اور فزیالوجی کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں"

اس بناء پر اگر موسیو پولہان اور موسیو ریبو کو نظرانداز کردیا جائے تو اس گروہ میں صرف لیبان پہلا شخص ہے جس نے اس کمی کو پورا کیا۔ اس نے تمام دنیا کی قوموں کے نظام اخلاق کا مطالعہ کیا۔ ان کے تاریخ و تمدن پر نگاہ ڈالی۔ ان دونوں میں سلسلہ علل و اسباب قائم کیا اور تمام تاریخی مظاہر۔ یعنی حکومت۔ سیاست۔ تمدن۔ مذہب اور لٹریچر وغیرہ کو اسی نظام اخلاق کا پرتو قرار دیا اور اس طرح ایک جدید فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ لیکن درحقیقت صرف لیبان ہی اس فلسفہ تاریخی کا موجد قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اسلام اور علماء اسلام نے مدتوں پہلے اس حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کردیا تھا۔ لیبان نے اس کتاب میں اگرچہ متعدد ابواب اور متعدد فصلوں میں اس موضوع پر بحث کی ہے لیکن تمام مباحث کی بنیاد صرف دو مقدمات پر قائم ہے۔

(ا) ہر قوم کا ایک مزاج عقلی ہوتا ہے۔ یعنی ہر قوم میں چند اخلاقی اوصاف پائے جاتے ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔

(۲) ان اخلاقی اوصاف میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

ان دونوں مقدمات کو اس نے ابتدا کی دو فصلوں میں ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد جو مباحث ہیں وہ انہی مقدمات کے نتائج ہیں یعنی بعد کی فصلوں میں

صرف یہ دکھایا ہے کہ تمام تمدنی مظاہر کو انہی غیر متبدل اخلاقی اوصاف نے پیدا کیا ہے۔ اس لئے جب کبھی ان میں کسی قسم کا انقلاب ہوا ہے تو تمدنی تاریخ کی بنیاد دفعتاً متزلزل ہو گئی ہے۔

لیبان نے اس کتاب میں ان مباحث کو جس خوبی کے ساتھ لکھا ہے وہ اس کا خاص حصہ ہے لیکن قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں بھی ہم کو ان اصول کا سراغ مل سکتا ہے کیونکہ قوموں کے عروج و زوال پر مادیت سے زیادہ روحانیت کا اثر پڑتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر لیبان کی تحقیق کے موافق صرف نظام اخلاق ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہر قسم کا تاریخی انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں اقوام قدیمہ کے تاریخی انقلابات و تغیرات کا جہاں ذکر آیا ہے اس کی علت صرف اخلاق اور روحانیت کو قرار دیا گیا ہے اور اس بناء پر قرآن مجید میں ان مباحث کے متعلق اجمالی اشارات مل سکتے ہیں۔ جن کو لیبان نے ایک مستقل تاریخی مسئلہ بنا دیا ہے۔ لیبان کا اساسی اصول یہ ہے کہ ہر قوم کی ایک خاص فطرت۔ ہر گروہ کا ایک خاص نظام اخلاق اور ہر فرقہ کا ایک خاص مزاج عقلی ہوتا ہے۔ اور انھیں کے ذریعہ سے اس میں تمام قومی۔ تمدنی اور سیاسی انقلابات پیدا ہوتے ہیں۔ دو قوموں میں اسی وقت امتزاج ہوتا ہے۔ جب ان کے نظام اخلاق میں اتحاد ہو۔ فنون لطیفہ کے تمام انواع میں ہر قوم اسی کو انتخاب کرتی ہے جو اس کے مزاج عقلی کے موافق ہو۔ ہر قوم اسی قسم کا نظام حکومت قائم کرتی ہے جو اس کی فطرت نفسانی کے مطابق ہو۔ غرض دنیا کا ذرہ ذرہ اخلاقی خصوصیات کا آئینہ ہے۔ لیبان نے اس مباحث کو جس تفصیل کے ساتھ لکھا ہے وہ قرآن و حدیث کے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ تاہم ان تمام چیزوں کا اصول اولین قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے **کل حزب بما لدیھم فرحون** ترجمہ:۔ ہر جماعت جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر خوش ہے یعنی لوگ اپنے مخصوص جذبات۔ خیالات۔ اور عقائد میں خوش ہیں۔ احادیث نے اس اصول کو اور بھی زیادہ صاف اور منقح کر دیا ہے۔

والناس معادن کمعادن الفضتہ والذھب خیاذھم فی الجاھلیہ خیاذھم فی

الاسلام اذا فقھوا والارواح جنود مجندہ فما تعارف منھا ائتلف وما تناکر منھا اختلف(ا) چاندی اور سونے کے کانوں کی طرح انسانوں کی بھی کانیں ہوتی ہیں۔ جو زمانہ جاہلیت میں اچھے تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی اچھے ہیں۔ بشرطیکہ علم حاصل کریں روحوں کی ایک مرتب فوج ہے۔ ان میں جو باہم مناسبت رکھتی ہیں وہ مل جاتی ہیں۔ اور جن میں یہ مناسبت نہیں ہوتی وہ الگ ہوجاتی ہیں۔

لیبان نے پہلے باب کی پانچویں فصل میں قوموں کے اختلاط کے جو اصول بتائے ہیں ان میں ایک یہ ہے۔

(ا) دونوں قوموں کے نظام اخلاق میں بہت زیادہ اختلاف نہ ہو۔

حدیث کے آخری ٹکڑے میں یہ اصول بہ تصریح مذکور ہے۔ لیبان کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر قوم کی مخصوص فطرت۔ مخصوص نظام اخلاق اور مخصوص مزاج عقلی میں عموماً" کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا۔ صرف ان کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم کے مظاہر اخلاق میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کبھی اس میں تغیر واقع ہوجاتا ہے تو قوم کا تمام نظام عمل دفعتاً" درہم برہم ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید میں اگرچہ یہ اصول بہ تصریح موجود نہیں ہے۔ لیکن لیبان نے اس اصول کی بنا پر جو نتیجہ نکالا ہے وہ قرآن مجید میں بہ تصریح مذکور ہے۔

ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسھم خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدل دے۔

یہ غیر متغیر اخلاقی خصوصیات جن اسباب کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں وہ لیبان کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

(ا) آباؤ اجداد یعنی گزشتہ سلسلہ خاندان کا اثر

(۲) ماں باپ کا اثر

(۳) ملک جغرافیانہ حدود۔ آب و ہوا اور گرد و پیش کی چیزوں کا اثر

ان اسباب میں تیسرا سبب مادی اور بقیہ اسباب روحانی ہیں۔ مادہ پرست لوگوں نے اگرچہ اسی تیسرے سبب کو نہایت اہمیت دی ہے لیکن لیبان کے نزدیک

وہ نہایت معمولی درجہ کی چیز ہے۔ اس کے نزدیک نظام اخلاق کا اصل مکوں آباؤ اجداو کا اثر ہے۔ اس کے بعد نوع انسانی پر ماں باپ کا اثر پڑتا ہے۔ مادہ اور ادہ کے خواص و آثار چونکہ قرآن مجید کے دائرہ بحث سے خارج تھے اس لئے اس نے تیسرے سبب کو بالکل نظرانداز کردیا اور آج بیسویں صدی میں لیبان کی تحقیق بتاتی ہے کہ وہ نظرانداز کرنے کے قابل بھی تھا۔ لیکن اصلی سبب یعنی آباؤاجداد کے اثر کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔

قالوا بل وجدنا ابانا کذلک یفعلون قالوا حسبنا ما وجدنا علیه آباء ناقالوا بل نتبع ما وجدنا علیه آباء نا وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجدا کو ایسا ہی کرتے پایا وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو جس روش پر پایا وہ ہمارے لئے کافی ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤاجداد کو جس روش پر پایا ہم اسی کی تقلید کرتے ہیں"

آباؤ اجداد کے اس موروثی اثر کے مظاہر اگرچہ ہر قوم کے جذبات۔ خیالات اور رسوم و عقائد ہوتے ہیں اور لیبان کے نزدیک انہی کی مجموعی ترکیب سے ہر قوم کا مزاج عقلی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں قومی روح کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر رسم و رواج ہے۔ قرآن مجید نے جس ایجاز و اختصار کے ساتھ "آبائی روش" کا ذکر کیا ہے اور اس میں اگرچہ رقم و رواج بھی داخل ہے لیکن شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اور اس کو ہر قوم۔ ہر تمدن۔ اور ہر مذہب کا نہایت ضروری عنصر قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"یقین کرو کہ رسم و رواج کو تمدن سے وہی نسبت ہے جو قلب کو انسان کے جسم سے اس لئے شریعت کا سب سے پہلا مقصد وہی ہے۔ اور شریعت الیہ میں اسی سے بحث ہوتی ہے۔ اگر انسان سے پوچھا جائے کہ وہ ان رسم و رواج کا کیوں پابند ہے تو اس کے سوا وہ اس کا کچھ جواب نہ دے سکے گا کہ اس نے اس میں اپنی قوم کی تقلید کی ہے۔ (۲۔)"

لیبان نے ایک خاص فصل میں تمدنی اصول کے اثر پر بحث کی ہے۔ اس

میں ایک موقع پر لکھتا ہے۔

"قومی روح پر ان اصول کا حقیقی اثر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک بتدریج ان کا خمیر پختہ نہ ہوجائے اور عالم عقل کی بلندی سے اتر کر وہ انسان کے غیر شاعرانہ مرکز عمل میں نہ آجائے۔"

انسان کا غیر شاعرانہ مرکز عمل وہ ہے جن میں وہ ایک اصول کو تسلیم کرتا ہے لیکن اگر اس سے اس کے علل و اسباب کا سوال کیا جائے تو وہ اس کی کوئی توجیہ و تعلیل نہیں کرسکتا۔ شاہ صاحب نے اخیر فقرے میں رسم و رواج کے اسی غیر شاعرانہ اثر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لیکن احادیث میں اخیر کے دونوں سبب یعنی ماں باپ۔ اور جغرافیانہ حدود اور آب و ہوا کے اثر کا ذکر بھی بہ تصریح موجود ہے۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ یمجسانہ ان اللہ خلق آدم من قبضہ قبضھا من جمیع الارض فجاء بنو ادم علی قدر الارض فجاء منھم الاحمر والابیض الاسود بین ذلک والسھل والحزن والخبیث والطیب (ترمذی ۲۸۲) ہر بچہ صرف ایک ہی فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے باپ ماں اس کو یہودی۔ نصرانی اور مجوسی بنالیتے ہیں خدا نے دنیا کے ہر حصے سے خاک کی ایک چٹکی لی اور اس سے آدم کو پیدا کیا۔ اس لئے بنی آدم بھی زمین کی اختلاف سے مختلف رنگ اور مختلف اخلاق کے پیدا ہوئے۔ بعض سرخ۔ بعض سفید۔ بعض سیاہ بعض متوسط بعض نرم۔ بعض سخت۔ بعض برے۔ بعض بھلے۔

حدیث میں اس سے زیادہ تفصیل منصب نبوت کے خلاف ہے۔ لیکن علامہ ابن خلدون نے آب و ہوا کے اثر پر ایک مستقل فصل میں بحث کی ہے۔ چنانچہ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"حبشیوں کی اخلاقی خصوصیت خفیف الحرکتی۔ غصہ۔ مسرت۔ اور حماقت ہے اس کا اصلی سبب جیسا کہ فلسفہ کی کتابوں میں ثابت ہوچکا ہے یہ ہے کہ خوشی اور مسرت روح حیوانی کے انتشار و انبساط اور رنج و غم اس کے انقباض و تکاثف کا نام ہے فلسفہ کی کتابوں میں یہ

بھی ثابت ہوچکا ہے کہ حرارت سے ہوا اور بخارات میں رقت پیدا ہوجاتی ہے اور اس لئے ان کی مقدار میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مست آدمی مسرت کا زیادہ احساس کرتا ہے کیونکہ شراب کی حدت اس کی روح کے بخارات کو زیادہ سیال بنادیتی ہے۔ اس اصول کی بناء ہر حبشی چونکہ گرم ملک کے باشندے ہیں اور ان کے مزاج پر حرارت کا غلبہ ہوگیا ہے۔ اس لئے ان کی روح میں بھی اسی نسبت سے حرارت موجود ہے اور یہی ان کی خوشی و مسرت۔ اور غیظ و غضب کا سبب ہے۔ چونکہ ساحلی مقامات کی ہوا بھی زیادہ گرم ہوتی ہے اس لئے ساحلی ممالک کے باشندوں کا حال بھی قریب قریب حبشیوں کے مشابہ ہے۔ جزائر کے رہنے والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ مصر بھی چونکہ جزائری ممالک کے قریب واقع ہے اس لئے مصریوں میں بھی خفیف الحرکتی۔ مسرت۔ اور انجام کار سے اس قدر بے اعتنائی پائی جاتی ہے کہ وہ لوگ گھر میں ایک سال اور ایک ماہ کی خوراک بھی نہیں رکھتے۔ بلکہ عموماً" بازاروں میں کھاتے ہیں۔"

اس کے بالکل برعکس۔ بلاد مغرب میں چونکہ فاس کے باشندے سرد پہاڑوں کے دامن میں رہتے ہیں اس لئے غم زدہ لوگوں کی طرح ان کی گردنیں جھکی رہتی ہیں اور وہ اس قدر عاقبت اندیش ہوتے ہیں کہ ان میں ہر شخص دو سال کی خوراک اپنے گھر میں مہیا رکھتا ہے اور صبح تڑکے اپنی روزی پیدا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تاکہ سرمایہ محفوظ میں کمی نہ آنے پائے۔ (۳)

کتاب کا عمود صرف یہی دو اصول اور یہی دو فصلیں ہیں۔ بقیہ مباحث انہی کے جزئیات و فروع ہیں۔ جن میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کا تمدن۔ اور اعلیٰ درجہ کی متمدن قومیں کیونکر فنا ہوجاتی ہیں۔ لیبان نے کتاب کے آخری باب اور آخری فصل میں اسی مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اور اس کا جو سبب بتایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "تمدن خود تمدن کا دشمن ہے" چنانچہ اس کے الفاظ حسب

ذیل ہیں۔

"جب کوئی قوم تہذیب و تمدن کے زیور سے آراستہ۔ اور نفوذ و قوت کے ہتھیار سے مسلح ہوجاتی ہے اور اس کو ہمسایہ قوم کے حملے کا خطرہ نہیں رہتا تو وہ نہایت عیش و طرب کے ساتھ جو دولت کا لازمی نتیجہ ہے زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔ اس لئے اس کے تمام فوجی محاسن برباد ہوجاتے ہیں۔ تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضروریات میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ہر شخص کے دل میں خودغرضی اپنا قدم جمالیتی ہے اور اس کا مطمع نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے ہاتھ آئے اس سے نہایت سرعت کے ساتھ ذاتی فائدہ اٹھائے۔ اس بناء پر تمام قوم عام مصالح سے اعراض کرنے لگتی ہے۔ اور قوم کے وہ تمام اخلاقی محاسن فنا ہوجاتے ہیں جو اس کی عظمت کا حقیقی سبب تھے۔ اب اس پر قرب و جوار کی وحشی یا نیم وحشی قوموں کا حملہ شروع ہوجاتا ہے۔ روم اور ایران کی سلطنتوں کا یہی حشر ہوا۔ ان کا نظام حکومت اگرچہ نہایت مستحکم تھا تاہم برابرہ نے روم کا خاتمہ کردیا اور عربوں نے ایران کے پرخچے اڑا دیئے"

قرآن مجید میں قوموں کی ہلاکت و برباری کا جو ذکر بار بار آیا ہے اس کے سلسلہ میں اگرچہ یہ اصول اجمالاً" مذکور ہے۔

واذ اردنا ان نھلک قریہ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرناھا تدمیرا۔ جب ہم کسی آبادی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دولت مند باشندوں کی تعداد و دولت میں اضافہ کردیتے ہیں۔ اس لئے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اور اب اس پر ہمارا قانون فطری منطبق ہوجاتا ہے اور ہم اس کو تباہ کردیتے ہیں۔

لیکن علامہ ابن خلدون نے اس آیت کو اصل قرار دے کر زوال تمدن پر جو جامع اور مفصل فلسفیانہ مضمون لکھا ہے وہ لیبان کے نظریہ پر حرف بہ حرف منطبق ہے۔ چنانچہ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"ہر شخص کی ایک انتہائی عمر ہوتی ہے۔ انسان کے نشوونما کا زمانہ چالیس سال تک رہتا ہے۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک نشوونما رک جاتی ہے۔ پھر انحطاط کا زمانہ شروع ہوجاتا ہے۔ تمدن کا بھی یہی حال ہے۔ جب شہری لوگوں کو دولت و ثروت مل جاتی ہے تو وہ فطرتاً" ان کو تمدنی سازوسامان کی طرف مائل کردیتی ہے۔ اس لئے ان کے کھانے پینے۔ رہنے سہنے۔ پہننے۔ اوڑھنے کی تمام چیزوں میں رنگینی اور اچھوتا پن پیدا ہوجاتی ہے۔ اور جب رنگین مزاجی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے تو انسان شہوانی خواہشوں کا غلام ہوکر دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کے مصارف میں اضافہ ہوجاتا ہے اور چونکہ سلطنت کے عین شباب کے زمانے میں تمدن اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ جاتا ہے اور ہر سلطنت میں ٹیکس لگانے کا یہی زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت سلطنت کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ اور ٹیکس کا تمام تر بار تجارت پر پڑتا ہے۔ کیونکہ تجارت پیشہ لوگ جو کچھ صرف کرتے ہیں اس کو اسباب تجارت ہی سے وصول کرتے ہیں اس لئے ٹیکس اشیاء کی اصل قیمت کا جزو ہوجاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متمدن لوگوں کے اخراجات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور ان کی تمام آمدنی انہی مصارف میں صرف ہوجاتی ہے اور وہ مفلس اور محتاج ہوجاتے ہیں۔"(۴)

شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں تاسیس شریعت اسلامیہ پر بحث کی ہے اس مسئلہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اور روم و ایران کی بربادی کی یہی وجہ بتائی ہے لیکن اس مسئلہ سے لازمی طور پر ایک دوسرا تمدنی مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے کہ جب کوئی قوم فنا ہوجاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایک دوسری قوم اس کی جانشین ہوجاتی ہے چنانچہ لیبان نے اس مسئلہ کی طرف ان الفاظ میں ضمناً" اشارہ کیا ہے۔

اب اس پر قرب و جوار کے وحشی یا نیم وحشی قوموں کا حملہ شروع ہوجاتا

ہے اور وہ اس کی تمدنی بنیاد کو ڈھاکر اس کے کھنڈر پر دوسرے تمدن کی عمارت قائم کرتی ہیں' " قرآن مجید میں بھی جہاں کہیں قوموں کے عروج و زوال کا ذکر آیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم کے فنا ہونے کے ساتھ ہی دوسری قوم منصۂ وجود پر جلوہ گر ہوجاتی ہے۔"

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیھا ولیستبدل قوما غیرکم ولا تضروہ شئیا"

فاھلکنھم بذنوبھم وانشانا من بعدھم قرنا آخرین۔

فان تولوا فقد ابلغتکم ما ارسلت بہ الیکم و یستخلف ربی قوما غیرکم ولاتضرونہ شئیا

اگر تم لوگ جہاد کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہوئے تو خدا تم کو سخت عذاب دے گا۔ اور تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکوگے۔ ہم نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو ہلاک کردیا اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا۔

اگر تم لوگ اعراض کرتے ہو تو میں نے اپنا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے۔ میرا خدا اب تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو اپنا جانشین بنائے گا اور تم اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

علامہ ابن خلدون نے بھی ایک خاص فصل میں اس مسئلہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بہ حرف لیبان کے نظریہ پر منطبق ہے۔ چنانچہ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"جب بانیان سلطنت عیش و طرف میں مصروف ہوجاتے ہیں تو اپنے دوسرے بھائیوں کو غلام بنالیتے ہیں اور ان کو سلطنت کے کاروبار میں لگادیتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے سلطنت میں کوئی حصہ نہیں پایا ہے۔ چونکہ انھوں نے ناز و نعم میں زندگی نہیں بسر کی ہے اس لئے وہ نوجوان باقی رہتے ہیں اور جب پہلے لوگ عیش پرستی کی وجہ سے بوڑھے ہوجاتے ہیں تو دوسرے گروہ کی عصبیت تازہ رہتی ہے۔ اس بناء پر وہ اپنا مرجع امید اس ملک کو بنادیتے ہیں جس سے وہ روک

دیئے گئے تھے۔ چنانچہ عرب میں جب عاد کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ان کے بھائی ثمود صاحب تخت و تاج ہوئے۔ ثمود کے بعد عمالقہ۔ عمالقہ کے بعد حمیر۔ حمیر کے بعد تبابعہ۔ اور تبابعہ کے بعد اذوا کا دور دورہ ہوا۔ اس کے بعد مصر کی سلطنت قائم ہوئی (۵) (اس کے بعد ایران اور مغرب کے انقلاب سلطنت کی متعدد مثالیں دی ہیں)

لیبان نے قوموں کے مزاج عقلی کے اختلاف کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مختلف المزاج قوموں پر حکومت کرنا سخت مشکل ہے۔ بلکہ اکثر حالتوں میں ان پر حکومت ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ایک موقع پر لکھتا ہے۔

"جن قوموں میں باہم کشمکش پیدا ہوتی ہے ان سب کا یہی حال رہ چکا ہے ان کے تمام تنازعات و اختلافات کا سرچشمہ مزاج عقلی کا یہی اختلاف تھا اس لئے جب قوموں کی نسل نے وسعت حاصل کی تو ان مختلف المزاج لوگوں کا ایک جھنڈے اور ایک قانون کے تحت میں رہنا مشکل ہوگیا۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے اس قسم کی مختلف قوموں پر حکومت کرنا چاہا ہے وہ خود مٹ گئے ہیں"

علامہ ابن خلدون نے بھی اس مسئلہ پر ایک مستقل فصل میں بحث کی ہے۔ اور اس کو مختلف مثالوں سے ثابت کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"اس کا سبب خیالات و جذبات کا اختلاف ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ عصبیت ان کی حمایت کرتی ہے۔ اس بناء پر ہر وقت سلطنت کی مخالفت میں ہنگامہ اور بغاوت ہوتی رہتی ہے۔ افریقہ اور مغرب میں ابتدائے اسلام سے آج تک جو واقعات پیش آئے ان کو اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ان ممالک کے برابرہ کے قبائل اور ان کی عصبیت میں چونکہ اختلاف تھا اس لئے ان پر ابن ابی سرح کا پہلا حملہ بالکل ناکامیاب رہا اور انھوں نے اس کے بعد متصل شورشیں برپا کیں ۔ اور وہاں مسلمانوں کی سخت خونریزی ہوئی اور جب وہاں اسلام کو استقرار و استحکام حاصل ہوگیا تب بھی انھوں نے اس روش کو

قائم رکھا۔ اور خارجی مذہب کے پابند ہو گئے۔ ابن ابی زید کہتا ہے کہ "مغرب کے بربرہ بارہ مرتبہ مرتد ہوئے۔ اور موسیٰ بن نصیر کی حکومت سے پہلے وہاں اسلام کو استحکام نہ حاصل ہوسکا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس مقولہ کا کہ افریقہ اپنے باشندوں کے دلوں کو پراگندہ رکھتا ہے" یہی مطلب ہے لیکن عراق اور شام کی یہ حالت نہ تھی ایرانی اور رومی متمدن اور شہری باشندے تھے۔ اس لئے جب مسلمانوں نے ان کو محکوم کیا تو کسی نے ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ خود بنی اسرائیل کے زمانے میں بھی شام کی حالت بعینہ مغرب اور افریقہ کی تھی۔ وہاں فلسطین کے متعدد قبائل۔ مثلاً" کعنان۔ بنو عیصو۔ بنو مدین۔ بنو لوط اور روم۔ یونان۔ عمالقہ۔ اکر یکش۔ نبط کے متعدد خاندان آباد تھے۔ اس بناء پر وہاں بنو اسرائیل کی سلطنت کو کبھی استحکام حاصل نہیں ہوا۔

اس کے بالکل برعکس جن مقامات میں اس قسم کی مختلف عصبیت نہیں پائی جاتی وہاں سلطنت کا قائم کرلینا نہایت آسان ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں مصرو شام کا یہی حال ہے۔ (۶)

لیبان اگرچہ عقلی حیثیت سے مذہب کو اوہام اور خرافات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ تاہم اس کو وہ تمدنی انقلاب کے لئے ایک نہایت موثر چیز خیال کرتا ہے۔چنانچہ اس نے مذہب کے تمدنی اثر کو ایک خاص فصل میں نہایت تفصیل کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔اس کے نزدیک مذہبی اثر کا فلسفہ یہ ہے۔

"مذہب کی عظیم الشان قوت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ایک زمانے میں قوم کے فوائد۔ قوم کے احساسات۔ اور قوم کے خیالات کو متحد کردیتا ہے۔ اس لئے وہ ان تمام عناصر کا جن سے قومی روح پیدا ہوتی ہے دفعتاً" قائم مقام ہوجاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مذہبی قوت کے استیلاء سے قوم کا مزاج عقلی نہیں بدل جاتا۔ تاہم تمام قوتوں کا رخ صرف ایک مقصد کی طرف ہوجاتا ہے۔ یعنی تمام طاقتیں اس جدید

مذہب کی حمایت میں کھڑی ہوجاتی ہیں اور مذہب کے عظیم الشان طاقت کا راز اسی اصول کے اندر مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے کارہائے نمایاں کئے ہیں اسی قسم کی مذہبی انقلاب کے زمانے میں کئے ہیں۔ اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی تاسیس اسی دور انقلاب میں ہوئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے الہامی خیالات نے اسی طریقہ سے قبائل عرب میں اتحاد پیدا کیا۔ اور ان لوگوں نے تمام قوموں کو زیر و زبر کرکے عظیم الشان سلطنت قائم کرلی۔"

لیکن درحقیقت اس نے اس موقع پر ابن خلدون کے الفاظ کا حرف بہ حرف اعادہ کردیا ہے۔ ابن خلدون نے ایک مختصر سی فصل میں ان خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اسی کا سبب یہ ہے کہ ملک غلبہ سے اور غلبہ عصبیت اور اتفاق سے حاصل ہوتا ہے۔ اور دونوں میں اتحاد صرف خدا اپنے مذہب کے قیام کے لئے پیدا کردیتا ہے۔ خدا خود کہتا ہے **لو انفقت مافی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم** اگر تم زمین کی تمام دولت صرف کرڈالتے تب بھی ان کو متحد نہیں کرسکتے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جب لوگوں کے دل ہوا پرستی۔ اور خواہشات دنیا کی طرف مائل ہوجاتے ہیں تو ان میں رشک و حسد اور اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ اور جب دنیا کو چھوڑ کر ان کا رخ خدا کی طرف ہوتا ہے تو ان کا مقصد متحد ہوجاتا ہے۔ رشک و حسد کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اختلافات کم ہوجاتے ہیں۔ طریقہ امداد و اعانت اور اتحاد میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اس لئے اس طریقے سے جو سلطنت قائم کی جاتی ہے۔ وہ بھی نہایت عظیم الشان ہوتی ہے۔(۷)

اس کے بعد کی فصل میں علامہ موصوف نے واقعات سے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں مثال فتوحات اسلامیہ کی ہے۔

لیبان کو فنون لطیفہ۔ بالخصوص فنون لطیفہ کی ایک خاص شاخ یعنی فن تعمیر سے خاص طور پر دل آویزی ہے۔ اور اس کو وہ ہر قوم کی تاریخ کا صحیح مآخذ

سمجھتا ہے۔ اس لئے اس نے عموماً" اپنی تمام کتابوں میں فنون لطیفہ پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور اس کتاب میں بھی ایک طویل فصل اس کی نذر کردی ہے۔ لیکن اس کتاب میں چونکہ صرف تاریخ کی تمام شاخوں کو ہر قوم اور ہر زمانے کے مزاج عقلی پر منطبق کرنا تھا۔ اس لئے لیبان نے فنون لطیفہ کے متعلق متعدد نظریات قائم کئے ہیں اور ان سے متعدد تاریخی نتائج نکالے ہیں۔ ان میں ایک نظریہ یہ ہے

"فنون لطیفہ چونکہ بعض خاص جذبات اور بعض خاص تمدنی ضروریات کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے ان جذبات اور ضروریات کے ساتھ لازمی طور پر ان میں تجدد اور تغیر ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی ان جذبات اور ضروریات کے تغیر و زوال سے وہ کلیتہ" معدوم بھی ہوجاتے ہیں" اس نظریے کی بناء پر اس نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس زمانے میں فنون لطیفہ نہایت عام اور مبتذل ہوگئے ہیں۔ کیونکہ وہ مذہبی خوش اعتقادیاں، وہ مذہبی ضرورتیں اور وہ مذہبی احساسات اب بالکل بدل گئے ہیں جو قدیم زمانے میں مذہبی عمارتوں کے اصلی معمار تھے۔

(۲) اب فنون لطیفہ صرف زیب و زینت کا ذریعہ خیال کئے جاتے ہیں اور چونکہ اب ان کا تمدنی ضروریات میں شمار نہیں کیا جاتا اس لئے اب وہ محض مصنوعی اور تقلیدی چیز ہوگئے ہیں۔ اسی بناء پر آج فنون لطیفہ کو کسی قوم کا مخصوص فن نہیں قرار دیا جاسکتا۔

(۳) قرون وسطیٰ کی سادہ تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے خوش اعتقاد مصور حوارئین، مسیح، جنت اور دوزخ کی جو تصویریں کھینچتے تھے ان کا اس زمانے میں خاص اثر تھا لیکن اس زمانے میں اس قسم کی جو تصویریں کھینچی جاتی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض نقالی ہے۔

(۴) ہمارے زمانے میں من حیث الفن صرف ان چیزوں کی تصویروں کو اصلی تصویر کہہ سکتے ہیں جو ہمارے گرد و پیش موجود ہیں۔ ہمارے زمانے کا اصل

فن تعمیر وہ ہے جو ہمارے سامنے پنج منزلہ عمارتوں' پانی کی نہروں بڑے بڑے پلوں اور ریلوے لائنوں کا ڈھانچہ کھڑا کر دیتا ہے۔

(۵) ان جذبات و ضروریات کے تغیر و تبدل سے دور جدید کے مکانات اور عہد قدیم کے گرجے دونوں زمانہ آئندہ کے انجینئر کو یکساں نظر آئیں گے۔

(۶) اگر کسی قوم کو فنون لطیفہ میں کامل دسترس ہوتی ہے تو وہ جنس مستعار کو اپنے خاص سانچے میں ڈھال لیتی ہے لیکن تمدن کی جو شاخیں خالص اس قوم کے جذبات کو نمایاں نہیں کرتیں ان پر اس کا بہت کم اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ جب رومن قوم نے یونانی طرز عمارت کی تقلید کی تو اس میں کوئی نمایاں تغیر نہیں پیدا کیا کیونکہ رومن قوم کی روح کا مظہر فنون لطیفہ نہ تھے بلکہ اس کا میلان تمدن کی دوسری شاخوں کی طرف تھا۔

(۷) ہر قوم فنون لطیفہ میں اپنے خاص جذبات کے مطابق تغیر پیدا کرتی ہے چنانچہ روما کی عمارتیں اپنے ماخذ ایتھنز کے نازک و لطیف خیالات کی ترجمانی نہیں کرتیں۔ بلکہ اس جنگی قوت اور فوجی شان و شوکت کا اظہار کرتی ہیں جن سے رومن قوم کو خاص مناسبت تھی۔

(۸) ہر صناع کی صناعی اس کی قوم اور اس کے زمانے کے عقائد۔ خیالات اور جذبات کی عکسی تصویر ہوتی ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا ہے اس میں اگرچہ وہ جامعیت' وہ تفصیل اور وہ حسن استنباط نہیں پایا جاتا جو لیبان کی کتاب میں پایا جاتا ہے تاہم کم از کم اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ابن خلدون کے دل میں بھی یہ بات کھٹکی ہے کہ بعض پیشے اور بعض صنعتیں کیوں بعض ممالک کے ساتھ مخصوص ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"یہ ظاہر ہے کہ شہریوں کے تمام کام ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ تمدن کا اقتضاء ہی یہی ہے۔ شہروں میں جن کاموں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں بعض کسی خاص شہر کے باشندوں کے ساتھ مخصوص ہوجاتے ہیں اس لئے وہ لوگ اس میں مہارت پیدا

کرتے ہیں۔ وہ ان کا خاص مشغلہ ہوجاتا ہے اور عام ضرورت کی بنا پر وہ ان کا ذریعہ معاش بن جاتا ہے۔ لیکن جو پیشے عام طور پر ذریعہ معاش ہوتے ہیں۔ وہ کسی ملک یا شہر کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے۔ درزی' لوہار' بڑھئی وغیرہ ہر شہر میں پائے جاتے ہیں۔ بہت سے کام اور بہت سے پیشے صرف امارت پسندی۔ اور عیش پرستی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا وجود صرف انہی شہروں میں پایا جاتا ہے جو تمدن و تہذیب کا مرکز ہوتے ہیں۔ مثلاً" شیشہ ساز۔ زرگر' عطر فروش' فراش۔' رکابدار وغیرہ صرف تمدن اور عیش پرستی کو جس قدر ترقی ہوگی اسی نسبت سے ان پیشوں کے انواع میں بھی اضافہ ہوگا۔ حمام اسی قسم کی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف ان شہروں میں پائے جاتے ہیں جو تمدن تہذیب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ متوسط درجے کے شہروں میں ان کا وجود نہیں پایا جاتا۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ اور روساء بھی وہاں جاکر آباد ہوجائیں۔ لیکن عام طور پر ان کی ضرورت نہ ہو تو وہ بہت جلد منہدم ہوجائیں گے اور ان کے مالک بھاگ کھڑے ہوں گے۔ (۸)

اس کتاب کا سب سے بڑا محور مزاج عقلی ہے جو بظاہر لیبان کی خاص ایجاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن علامہ ابن خلدون نے مدتوں پہلے اس کا پتہ لگالیا تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"قبائل کی عصبیت عامہ مثل مزاج کے ہے۔ اور مزاج عناصر کی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اپنے موقع پر ثابت ہوچکا ہے کہ جب عناصر کی قوت برابر درجہ کی ہوتی ہے تو اس سے مزاج نہیں پیدا ہوتا۔"

بہرحال لیبان کو جس فلسفہ تاریخ کی ایجاد کا شرف حاصل ہے وہ اگرچہ ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ سے مختلف ہے۔ تاہم چونکہ دونوں کا موضوع ایک ہے اس لئے جابجا دونوں کے مضامین میں اشتراک پایا جاتا ہے اور اس بناء پر ہم دلی

زبان سے کہہ سکتے ہیں کہ لیبان کے نظریات سے اسلامی لٹریچر بالکل ناآشنا نہیں ہے۔

حواشی

(۱) مسلم مطبوعہ مصر جلد ۲ ص ۴ کتاب البر والصلہ والاداب باب الارواح جنود مجندہ۔

(۲) حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ص ۱۳۸

(۳) مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۹۷

(۴) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۹ یہ مضمون بہت بڑا ہے ہم نے ابتدا کی چند سطروں کا خلاصہ کردیا ہے۔

(۵) مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۱

(٦) مقدمہ ابن خلدون ص ۱۸۱ے

(۷) مقدمہ ابن خلدون ص ۱۷۳

(۸) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۱۵

مقدمہ مصنف

موجودہ زمانہ میں مذہب مساوات

اور

تاریخ کی روح

تخیل مساوات کی نشوونما اور اس کی ترقی۔ اس تخیل کے نتائج۔ نظام عمل پر اس کا اثر موجودہ دور میں جماعتوں پر اس کا اثر۔ اس کتاب کا موضوع بحث۔ انقلاب اقوام کے اہم موثرات پر ایک عام بحث' کیا تمام تمدنی شاخوں یعنی نظام حکومت۔ فنون لطیفہ۔ اور عقائد وغیرہ کی کوئی نفسانی روح ہے جو ہر قوم کے ساتھ مخصوص ہے؟ تاریخی انقلابات اور ان کے مستحکم فطری قوانین۔

ہر قوم کے تمدن کا دارومدار چند اساسی اصول پر ہوتا ہے جو اس کے نظام حکومت' نظام اخلاق اور فنون لطیفہ کا سنگ بنیاد ہوتے ہیں۔ اور جن کے عدم اور وجود دونوں کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔

یہ اصول اگرچہ بعض حالتوں میں صحیح نہیں ہوتے' لیکن ان کی غلطی صرف روشن دماغ لوگوں کو محسوس ہوتی ہے باقی عام لوگ ان کو ایک ناقابل انکار حقیقت سمجھتے ہیں۔ گردش زمانہ کے ساتھ ساتھ ان سے متاثر ہوتے ہیں اور ان

کے موافق عمل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی جدید مذہب کے قائم کرنے اور قدیم مذہب کے مٹانے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لیکن بعض فلاسفہ نے نوع انسانی کی تاریخ۔ اس کی قوت عقلیہ کے انقلابات۔ اور اس کے قوانین تناسل طبعی کے تغیرات کو نظرانداز کردیا۔ اور اقوام و افراد کے درمیان مساوات کے خیال کی اشاعت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس خیال نے جماعت کو اس قدر گرویدہ بنالیا اور اس شدت کے ساتھ ان کے دماغ میں جاگزیں ہوگیا کہ اس میں چند ہی دنوں کے بعد برگ و بار نکل آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم جماعتوں کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ عظیم الشان شورشیں برپا ہوئیں۔ یہاں تک کہ اس نے یورپ کو اٹھاکر ایک تلاطم خیز سمندر میں ڈالدیا۔ جس کا نتیجہ خدا جانے آئندہ کیا ہوگا؟

اگرچہ مختلف افراد اور مختلف اقوام میں باہم جو فرق و امتیاز قائم ہے وہ عام طور پر اس قدر مسلم ہے کہ اس سے خود ان فلاسفہ کو بھی انکار نہیں۔ لیکن انھوں نے نہایت عجلت کے ساتھ یہ عقیدہ قائم کرلیا ہے کہ "وہ طریقہ تعلیم و تربیت کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ ورنہ فطرتاً" تمام انسان ذہانت اور پاکیزہ نفسی میں یکساں پیدا ہوئے۔ لیکن اس خمیر کو نظام حکومت نے خراب کردیا ہے" جن لوگوں نے نہایت آسانی کے ساتھ یہ عقیدہ قائم کرلیا ہے' اس کی دوا کا ایجاد کرنا بھی ان کے لئے کوئی دشوار کام نہ تھا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ اگر نظام حکومت میں تغیرات پیدا کئے جائیں اور تمام لوگوں کے لئے ایک متحدہ نظام تعلیم قائم ہوجائے تو یہ تمدنی مرض آسانی کے ساتھ زائل ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام حکومت اور مسئلہ تعلیم موجودہ دور کے حزب الاحرار کا سرمایہ حیات بن گیا ہے اور ان کے نزدیک صرف انہی دو چیزوں کے ذریعہ سے اس فرق و امتیاز کو جو موجودہ زمانے کے اصول کو زخمی کررہا ہے مٹایا جاسکتا ہے۔ لیکن اب علم نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے اور اس نے بدلائل ثابت کردیا ہے کہ مذہب مساوات صحیح نہیں ہے اور مختلف اقوام کی عقل میں زمانے نے جو عظیم الشان فرق مراتب پیدا کردیا ہے وہ متعدد نسلوں کے بعد مختلف موثرات کے متواتر عمل ہی سے

زائل ہوسکتا ہے۔ اب تک علم النفس جس درجہ تک پہنچ چکا ہے اس سے مختلف تجربوں کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ جو نظام حکومت اور جو طریقہ تعلیم و تربیت چند افراد یا ایک قوم کے لئے مفید ہے۔ وہ دوسرے افراد اور دوسری قوم کے لئے مضر ہے۔ باایں ہمہ جو مذہب ہر دماغ میں سرایت کرگیا ہے اس کا ابطال فلاسفہ کے دسترس سے باہر ہے کیونکہ کوئی خیال جو دلوں میں جاگزیں ہوجاتا ہے تو اس کی حالت اس دریا کے مشابہ ہوجاتی ہے جس کا پانی طغیانی کی حالت میں پل کے اوپر سے گزر کر کھیتوں میں پہنچتا ہے۔ اور زراعت کو بہا لے جاتا ہے۔ اور کوئی چیز اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔

یہ خیال مذہب یعنی مذہب مساوات جس نے کل دنیا کے نظام کو الٹ دیا ہے جس نے براعظم یورپ میں ایسی شورش برپا کردی ہے جس سے دنیا لرز اٹھی ہے۔ جس نے براعظم امریکہ میں قومی لڑائی کی آگ بھڑکا دی ہے۔ اور جس نے فرانس کی تمام نو آبادیوں کو ایک افسوسناک حالت انحطاط میں مبتلا کردیا ہے۔ اس کی نسبت ہر ماہر علم النفس۔ ہر بالغ النظر سیاح۔ ہر تجربہ کار سیاسی مدبر یقین رکھتا ہے کہ وہ سرتاپا غلط ہے۔ باایں ہمہ ان میں بہت کم لوگ اس کے مقابلہ کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔

اب تک یہ مذہب اپنے دور تنزل کو نہیں پہنچا ہے۔ بلکہ روز بروز ترقی کررہا ہے کیونکہ (ا) اشتراکین کا دعوی ہے کہ مغربی قوموں کے فوز و فلاح کا ذریعہ وحید صرف وہی ہے۔ اسی مذہب کے بل پر عورت مرد سے مساویانہ حقوق اور مساویانہ تربیت کی خواستگار ہے۔ اور دونوں جنسوں کی قوت عاقلہ میں جو نوعی فرق ہے اس کو بھول گئی ہے۔ لیکن اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہوگئی تو نہ یورپین مرد کو قیام کے لئے گھر ملے گا۔ نہ طمانیت قلب حاصل کرنے کے لئے کنبہ اور خاندان میسر ہوگا۔

اصول مساوات سے جو سیاسی اور تمدنی انقلابات پیدا ہوتے ہیں اور جن کا ظہور آئندہ زمانے میں ان سے بھی زیادہ خطرناک صورتوں میں ہوگا خود یورپین قوموں کو ان کی مطلق پروا نہیں ہے۔ مدبرین سیاست کی عملی زندگی ایک خاص

مرکز میں محدود ہوگئی ہے اور اس کے ساتھ عام رائے کو اس قدر غلبہ حاصل ہوگیا ہے کہ وہ خود حکومتوں پر حکومت کرنے لگی ہے۔ اور اس کی تقلید ہر شخص پر فرض ہوگئی ہے۔ اس لئے وہ بھی ان واقعات کے ساتھ کچھ قوم سے زیادہ اعتناء نہیں کرتے۔

ہر مذہب کی اہمیت کا اندازہ صرف اس اثر سے ہوسکتا ہے جو اس کے پیرو کے دل پر پڑا ہے۔ خود اصل مذہب کی صحت اور غلطی ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جو صرف حکماء کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہے۔ ورنہ عملی طور پر جب کوئی اصول عوام کے دماغ میں سرایت کرجاتا ہے تو وہ صحیح ہو یا غلط ' اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا فرض ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عوام کے فریفتہ کرنے کے لئے لوگ جس مذہب کو نظام حکومت اور نظام تعلیم کے ذریعہ سے ثابت کرتے ہیں' فطرتی قوانین نے جو مظالم کئے ہیں ان کی اصلاح کی طمع دلاتے ہیں۔ اور عرب' ایشیا اور حبش کے لوگوں کو ایک ہی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال اگرچہ غلط ہے لیکن خیالات کے مفاسد کو صرف تجربہ ہی کے ذریعہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ خود عقل انسان کے اعتقاد میں کوئی تزلزل نہیں پیدا کرسکتی۔ اس کتاب میں ان اخلاق نفسیہ کی تفصیل کی گئی ہے جن سے قوموں کی روح پیدا ہوتی ہے۔ اور بدلائل ثابت کیاگیا ہے کہ ہر قوم کی تاریخ اور اس کے تمدن کا مآخذ یہی اخلاق ہیں۔ یہ کتاب کا اصل موضوع ہے۔ اس اس موضوع کے لحاظ سے ہم کو اس میں تاریخی قوموں کی تولید کے اسباب اور اس کے مزاج عقلی کے طریقہ تربیت سے بحث کرنا ہوگی۔

تاریخی قوموں سے وہ قومیں مراد ہیں جن کا ظہور تاریخی زمانہ کے بعد ہوا ہے۔ اور ان کی تکوین فتوحات ہجرت۔ اور سیاسی انقلابات کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ یہی طریقہ تکوین ان کی تاریخی کا اصل مآخذ ہے۔ اور اسی سلسلہ میں ان کے نظام اخلاق کی پائداری اور اس کے انقلابات کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔ پھر اس مسئلہ پر نظر ڈالیں گے کہ مختلف قومیں اور مختلف افراد۔ مساوات کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ یا اس کے برعکس ان میں فرق و

تفاوت پیدا ہوتا جاتا ہے پھر یہ دیکھیں گے کہ تمام تمدنی شاخیں۔ یعنی فنون لطیفہ۔ نظام حکومت اور عقائد وغیرہ قومی روح کا مظہر ہیں یا نہیں؟ جس کی بناء پر دوسری قوم اس کی نقل و تقلید نہیں کرسکتی۔ سب سے اخیر میں ان جابرانہ اسباب سے بحث کریں گے جس کی وجہ سے تمدن کا چراغ گل ہوجاتا ہے۔ اور اس کے تمام آثار مٹ جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام مباحث کی تفصیل صرف اس قدر کی جائے گی جتنی اصول و مبادی کے توضیح و اثبات کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ ہم نے مشرقی تمدن پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں ان مباحث کا پورا استقصاء کردیا ہے۔ اور یہ مختصر کتاب صرف انہی کا خلاصہ ہے۔

میں نے مختلف ممالک کی سیرو سیاحت میں جن چیزوں کا مطالعہ کیا ان میں مجھے خاص طور پر یہ نظر آیا کہ ہر قوم کا ایک خاص "مزاج عقلی" ہوتا ہے جس میں خواص جسمانی کی طرح استحکام اور پائداری پائی جاتی ہے۔ اور اس کے تمام احساسات۔ خیالات۔ معتقدات۔ نظام حکومت اور فنون لطیفہ اسی مزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ ٹاکویل اور دوسرے اکابر فلاسفہ کا خیال ہے کہ قوموں کے تمام انقلابات و تغیرات نظام حکومت کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن میرا خیال بالکل اس کے برعکس ہے چنانچہ ٹاکویل نے جن قوموں کے حالات سے بحث کی ہے میں خود انہی حالات کو استدلالاً پیش کرکے یہ ثابت کرسکوں گا کہ تمدن پر نظام حکومت کا اثر بہت کم پڑتا ہے۔ اور وہ اکثر معلول اور علت بہت کم ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوموں کی تاریخ مختلف عناصر سے مرکب ہوتی ہے۔ اور انہی عناصر میں وہ شخصی اور اتفاقی واقعات بھی شامل ہیں جن کا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ لیکن اس سلسلے سے الگ چند پائدار اصول کلیہ بھی ہیں۔ جن کے مطابق ہر قوم کی تمدنی رفتار واقع ہوتی ہے۔ ان اصول میں سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ پائدار اور مزاج عقلی ہے اور ہر قوم کی زندگی۔ یعنی اس کا نظام حکومت۔ اس کے معتقدات اور اس کے فنون لطیہ اسی روحانی بناوٹ کے تاروپود ہیں اور اس لئے جب تک کوئی قوم اس روح کو نہ بدل لے ان تمام چیزوں کو نہیں بدل سکتی۔ یہ سچ ہے کہ ہمارا یہ نظریہ تاریخوں میں مذکور نہیں

ہے، لیکن ہم نہایت آسانی کے ساتھ ثابت کردیں گے تاریخی واقعات ہمارے خیالات میں جو اختلاف نظر آتا ہے، وہ حقائق واقعیہ پر مبنی نہیں بلکہ بالکل سطحی اور ظاہری ہے جن مصلحین نے ایک صدی سے بتدریج ہر چیز میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے خدا۔ زمین۔ اور دنیا کی کل آبادی کو بدلنا چاہا ہے وہ لوگ بھی قوموں کی فطرت کے بدلنے میں بہت کم کامیاب ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مخلوقات میں عموماً" اور نوع انسانی کی افراد میں خصوصاً" جو فرق و امتیاز نہایت مستحکم طور پر قائم ہوگیا ہے وہ اس زمانے میں اشتراکین کے مذہب پر بالکل منطبق نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس مذہب جدید کے مبلغین وہم کے مرض میں مبتلا ہیں اور اگرچہ قدماء نے انسان کے فطرتی مطمح نظر یعنی سعادت دنیوی پر جو بحثیں کی ہیں ان لوگوں کے خیالات کا ماخذ بھی وہی ہیں۔ لیکن محض علمی دلائل سے ان کی تسکین نہیں ہوسکتی۔ مساوات کے خیال کا قدم اگر انسان کے فطرتی فرق مراتب کے پیچ و خم میں الجھ نہ جاتا تو اس کی قیمت بھی ان توہمات سے کم نہ ہوتی جن کے پیچھے پیچھے انسان نے اپنی زندگی کے تمام مراحل طے کئے ہیں۔ اگر اس فرق مراتب کے ساتھ ان کیفیتوں کا بھی اضافہ کرلیا جائے جو پیری اور موت کی صورت میں انسان پر طاری ہوتی رہتی ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ تفریق فطرت کے ان عالمگیر مظالم کا ایک لازمی جزو ہے جن کے دائرہ حکومت سے انسان نکل نہیں سکتا۔

حاشیہ

(۱) عربی زبان میں "سوشیلزم" کو "اشتراکیت" اور "سوشیالسٹ" کو "اشتراکی" کہتے ہیں اور ہم نے ہر جگہ یہی عربی لفظ استعمال کیا ہے۔

پہلا باب

قوموں کی نفسانی فطرت

پہلی فصل

قوموں کی روح

تقسیم انواع میں طبعیین کا طریقہ' اس طریقہ تقسیم کا انطباق نوع انسان پر

انواع انسانی کے موجودہ طریقہ تقسیم کی غلطی کا بیان' نفسی طریقہ تقسیم کا سنگ بنیاد' قوم میں طبقہ متوسط کی مثال' بحث و استدلال کے ذریعہ سے اس کا علم کیونکر ہوسکتا ہے؟ وہ موثرات نفسیہ جن کے ذریعہ سے قوم میں طبقہ متوسط کی مثال پیدا ہوتی ہے' آباؤ اجداد کا اثر' ایک قوم کے ہر فرد میں جو عام فطرت نفسیہ پائی جاتی ہے' گزشتہ نسل کا موجودہ نسل پر عظیم الشان اثر۔ اس اثر کے تحقیقی اسباب۔ تمام قوم کی مشترکہ روح خاندان سے گاؤں میں' اور گاؤں سے شہر میں' اور شہر سے ملک میں کیونکر منتقل ہوئی؟ شہری اتحاد خیال کے فوائد اور اس کے نقصانات' کن حالات میں تمام قوم کی متحدہ روح کا پیدا ہونا محال ہوتا ہے؟ اٹلی کی مثال' فطرتی قومیں کیونکر برباد ہوئیں' اور کیونکر تاریخی قوموں نے انکی جگہ لے لی؟

نباتات اور حیوانات کی طرح' قدرت کی بوقلمونیوں کا سب سے عجیب و غریب مظہر انسان ہے افراد کے تشخصات ایک طرف' خود ہر قوم' ہر ملک' ہر نسل میں اس قدر عظیم الشان اختلافات موجود ہیں کہ انسانیت کے مفہوم کلی کے سوا ان میں کسی قسم کا اشتراک نہیں پایا جاتا اس بناء پر سوال یہ ہے کہ اگر اس وصف کلی سے قطع نظر کرلی جائے' تو مختلف قوموں کی تقسیم و امتیاز کا کیا معیار قرار دیا جاسکتا ہے؟ علمائے طبعیین نے رنگ روپ' ڈیل ڈول' قدو قامت' اور دماغی ساخت' کے اختلاف کو انواع انسانی کا مابہ الامتیاز قرار دیا ہے۔ یورپین قوموں کا رنگ سفید ہوتا ہے' حبشی سیاہ فام ہوتے ہیں'چینیوں اور جاپانیوں کا رنگ زرد ہوتا ہے' غرض ہر قوم جسمانی اوصاف کے لحاظ سے دوسری قوم سے مختلف ہوتی ہے' اور انہی اعراض جسمانیہ کے اشتراک و اختلاف کی بنا پر انسان کو مختلف انوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ظاہر بین نگاہیں اگرچہ اس تقسیم کو صحیح سمجھتی ہیں' لیکن در حیقیقت یہ کوئی جامع تقسیم نہیں ہے جسمانی فرق و امتیاز کا مظہر صرف وہی قومیں ہوسکتی ہیں جن میں خلقتہ" کسی قسم کا اتحاد نہیں ہوتا' اس لئے ان امتیازات کی بنا پر انسان کی تقسیم صرف حبشی' یورپین' چینی' غرض اسی قسم کی چند محدود انواع میں ہوسکتی ہے' لیکن دنیا میں متعدد قومیں ایسی بھی ہیں' جنکے رنگ روپ' ڈیل ڈول' اور خط و خال میں کوئی نمایاں اختلاف نہیں پایا جاتا' بااین ہمہ ان کی قومیت مختلف ہے' ان کے احساسات مختلف ہیں' اور احساسات و جذبات کے اس اختلات نے ان کے عقائد ان کے تمدن' اور ان کے علوم و فنون میں بھی اختلاف پیدا کردیا ہے' ایک اسپینش (باشندہ اسپین) اور ایک انگریز' جسمانی حیثیت سے متحد الاوصاف ہیں' لیکن دونوں کو ایک ہی نوع کا فرد قرار نہیں دیا جاسکتا' کیونکہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی عقلی حد فاصل قائم ہے جو ان دونوں قوموں کی تاریخ کے ہر صفحہ سے نمایاں ہوتی ہے' اسی بنا ہر بعض لوگوں نے اس قسم کی متشابہ الخلقہ قوموں کی تقسیم کی معیار' زبان' مذہب' اور نظام سیاست کے اختلافات کو قرار دیا ہے' لیکن اس تقسیم کی غلطی اس قدر واضح ہے کہ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں'

لیکن ابھی ہم کو نوع انسانی کی صحیح و جامع تقسیم سے مایوس نہ ہونا چاہئے' انسان صرف چند جسمانی اعراض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے' وہ اپنے اندر ایک غیر متبدل روح بھی رکھتا ہے' اس لئے اگر ان اعراض کا اختلاف' زبان کا اختلاف' ملک کا اختلاف' نظام سیاست کا اختلاف' نوع انسان کی صحیح تقسیم نہیں کرسکتا' تو ہم کو علم النفس اس مقصد میں کامیاب بناسکتا ہے کیونکہ اس کی روشنی میں ہم کو ان اخلاقی اور عقلی اوصاف کی جھلک نظر آتی ہے' جو عقائد' سیاست اور فنون لطیفہ کے ذریعہ سے قوموں کے درمیان اختلافات و تغیرات پیدا کرتے ہیں' اور انہی اوصاف کے مجموعہ سے ہر قوم کے قالب میں ایک جدید روح پیدا ہوتی ہے۔

عناصر کی ترکیب سے جو مزاج پیدا ہوتا ہے' اس کے علاوہ ہر قوم کا ایک عقلی مزاج بھی ہوتا ہے' جو استقلال' استحکام اور پائداری میں اعراض جسمانیہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا' اگرچہ اس عقلی مزاج کو نظام جسمانی' یعنی دماغی ساخت سے ایک خاص قسم کی مناسبت ہوتی ہے' تاہم اب تک علمی ترقی اس مناسبت کے دریافت کرنے سے قاصر ہے' اس لئے ہم اس کو تقسیم انواع انسانی کا قاعدہ کلیہ نہیں بناسکتے۔

یہ اخلاقی اور عقلی اوصاف' جن کے مجموعہ سے ہر قوم میں ایک مشترک روح پیدا ہوجاتی ہے' زمانہ کے سینکڑوں برس کی گردشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ہر قوم کے عہد گزشتہ کا خلاصہ اس کے آباؤاجداد کی وراثت اور اس کی موجودہ روش کا مبداء اولین ہیں

اگرچہ بعض افراد میں یہ اوصاف مختلف طور پر پائے جاتے ہیں' لیکن عوارض جسمانی کی طرح' قوم کی غالب تعداد ان اوصاف میں اشتراک رکھتی ہے اور وہ ان عوارض کی طرح ہمیشہ نئی نسل کے ساتھ نئے اور تازہ ہوتے رہتے ہیں' انہی اوصاف کے مجموعہ سے وہ وصف عام پیدا ہوجاتا ہے' جس کو کسی قوم کا نظام اخلاق کہا جاتا ہے' اور یہی معتدل اخلاقی روش ہر قوم کے کارناموں کا دیباچہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک ہزار فرنچ' ایک ہزار انگریز' اور

ایک ہزار چینیوں کا الگ الگ مجموعہ فرض کریں' تو اس میں ہر موقع پر باہم عظیم الشان اختلاف نظر آئے گا' بااین ہمہ ان قوموں کے ہر فرد میں ان اوصاف کی نمایاں جھلک نظر آئے گی' جو ان کی مخصوص قومیت کا لازمی نتیجہ ہیں' علمائے طبیعین نے (مثلاً) کتے اور گھوڑے کی دو جداگانہ نوعیں اس بنا پر قرار دی ہیں' کہ ان جانوروں کے مخصوص اوصاف مشترک طور پر صرف انہی کے افراد میں پائے جاسکتے ہیں' اور اور دوسرے جانوروں کے افراد میں ان کا وجود نہیں پایا جاتا' بعینہٖ اسی اصول کے موافق ہم فرنچ' انگریز' اور چینیوں کو الگ الگ انواع میں تقسیم کرسکتے ہیں' کیونکہ ان قوموں کے اخلاقی اور عقلی اوصاف میں بھی کسی دوسری قوم کا فرد شریک نہیں ہوسکتا۔

اگر کسی قوم پر اس قدر زمانہ گزر جائے کہ اس کے عناصر اور افراد میں باہم امتزاج پیدا ہوجائے' تو ہر شخص نہایت آسانی کے ساتھ ان افراد کے اندر اس معتدل اخلاقی روش کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی جدید ملک میں قدم رکھتا ہے' تو سب سے پہلے اس کو انھیں عام قومی اخلاق کا منظر نظر آتا ہے' جو بار بار اس کی نگاہ سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس عام قومی اخلاق کے علاوہ ہر فرد کا ایک ذاتی خلق بھی ہوتا ہے' لیکن چونکہ وہ اس کثرت سے بار بار نظر نہیں آتا' اس لئے ایک سیاح کی نگاہ اس پر نہیں پڑتی' اسی بنا پر انسان' اول نظر میں ایک انگریز' ایک اٹالین' اور ایک اسپینش کو پہچان لیتا ہے' اور نہایت آسانی کے ساتھ ان کے مخصوص اخلاقی' اور دماغی اوصاف کو ان کی طرف منسوب کردیتا ہے۔

یہ اوصاف اگرچہ الگ الگ ہر فرد پر منطبق نہیں ہوتے' لیکن تمام قوم اس معیار پر ٹھیک اترتی ہے۔

قوم میں یہ متحدہ مزاج عقلی جن اسباب کی بنا پر پیدا ہوتا ہے وہ علم وظائف الاعضاء میں مذکور ہیں' اور اسکی بنا پر ہم کہ سکتے ہیں کہ انسان صرف اپنے ماں باپ کی اولاد نہیں بلکہ اپنے پورے سلسلہ خاندان کا فرزند ہے' ہر ملک اور ہر قوم کے نظام اخلاق کا مبدا اولین اس کے آباؤ اجداد ہیں' اس کا مایہ خمیر

اور قالب بالکل متحد ہے اور وہ ہمیشہ اسی زنجیر کی طرف کھنچتی رہتی ہیں جس کی وہ آخری کڑی ہے' پس انسان مادر وطن کی پرستش صرف جذبات و احساسات ہی سے متاثر ہوکر نہیں کرتا' بلکہ ان جذبات کے پیدا کرنے میں نظام جسمانی کی طرح موروثی نظام اخلاق کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

بہرحال انسان کی عملی زندگی کے موثرات سادہ طور پر تین قسموں میں منقسم کیے جاسکتے ہیں۔ (۱) آباؤ اجداد یعنی گزشتہ سلسلہ خاندان کا اثر جو تمام اسباب سے زیادہ تری ہوتا ہے۔

(۲) ماں باپ کا اثر

(۳) ملک' جغرافیانہ حدود' آب و ہوا اور گرد و پیش کی چیزوں کا اثر۔

بعض لوگوں نے انسان کے نظام اخلاق کے اسباب میں اسی تیسری قسم کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے' لیکن درحقیقت وہ ان تمام موثرات میں سب سے کم درجہ کا موثر ہے' ملک' آب و ہوا' اور ان تمام مادی اور روحانی چیزوں کا اثر جو ان کے تحت میں داخل ہیں' انسان کی تمام زندگی' بالخصوص زمانہ تربیت پذیری میں بہت کم نمایاں ہوتا ہے' البتہ ان کا مستقل اثر اس وقت ظاہر ہوتا ہے' جب ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں انسان کی متعدد نسلیں گزر جاتی ہیں' اس لئے ان کا اثر درحقیقت سلسلہ خاندان ہی کے ذریعہ سے انسان کے رگ و پے میں سرایت کرتا ہے' ورنہ وہ بذات خود کوئی اہم چیز نہیں۔

اس لحاظ سے انسان اپنی عملی زندگی میں صرف اپنی قوم کا بیٹا ہوتا ہے' اور وہ تمام خیالات و احساسات جن کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے' اس کی قوم کی روح ہوتے ہیں' اس روح کی حقیقت اگرچہ مخفی ہے' لیکن اس کے آثار آفتاب کی طرح نمایاں ہیں' کیونکہ اسی کے ذریعہ سے قوموں میں تغیرات و انقلابات پیدا ہوتے ہیں۔

قوم اس مجموعہ خلیات (Cell) سے مشابہ ہے جس سے ہر فرد پیدا ہوتا ہے۔ ان خلیات کی زندگی کا زمانہ بذات خود نہایت مختصر ہوتا ہے' لیکن ان سے جو ذات پیدا ہوئی ہے وہ مدتوں تک زندہ رہتی ہے' اس لحاظ سے ہر خلیہ

زندگی رکھتا ہے' ایک تو اس کی شخصی زندگی' جو خود اس کو زندہ رکھتی ہے' دوسری وہ کلی زندگی جس سے وہ فرد زندہ رہتا ہے' جو ان کے مجموعہ سے پیدا ہوا ہے' بعینہ اسی طرح قوم کا ہر فرد' ایک نہایت محدود شخصی زندگی رکھتا ہے' لیکن اس کی کلی زندگی جو اس مجموعے قوم کی زندگی سے عبارت ہے' جو اس فرد کی طرح دوسرے افراد سے بھی مرکب ہے' نہایت طویل اور غیرفانی ہوتی ہے' اسی اخیر زندگی کا نام "قومی زندگی" ہے اور قوم ہمیشہ اسی کے آثار و نتائج سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔

اس بنا پر قوم کو ایک ابدی ذات سمجھنا چاہئے' جو زمانہ کے قیود سے آزاد ہے اور وہ صرف انہی زندہ افراد سے مرکب نہیں' جنھوں نے اس کو ایک محدود زمانہ میں ترقی دی ہے' بلکہ اس کا ایک عنصر وہ مردے بھی ہیں جو اس قوم کے آباؤ اجداد تھے' اس لئے قوم کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے کے لئے ماضی و مستقبل دونوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے' لیکن ان دونوں عنصروں میں مردوں کا اثر زیادہ قوی ہوتا ہے' کیونکہ ان کی تعداد زندہ افراد سے زیادہ ہوتی ہے' اور غیر شاعرانہ (ا) زندگی میں انھیں کا اثر زیادہ نمایاں ہوتا ہے' پس قوم زندہ لوگوں سے زیادہ مردوں کے نقش قدم پر چلتی ہے' زندہ افراد نے صرف قوم کو پیدا کیا ہے' لیکن عدم آباد کے رہنے والوں نے ان زندہ افراد میں خیالات و جذبات کی روح پھونکی ہے۔

زمانہ کی حرکت کا مبداء مردوں ہی کی ہڈیاں ہوتی ہیں' کیونکہ قوم صرف مادیات میں اپنے اسلاف کی پیروی نہیں کرتے' بلکہ وہ ان کے جذبات و احساسات سے بھی متاثر ہوتی ہے۔

اگرچہ کوئی قوم نوع حیوان کی تکوین کی طرح' مزاج عقلی پیدا کرنے میں بہت زیادہ طویل زمانے کی محتاج نہیں ہوتی' تاہم یہ مزاج چند دنوں میں بھی نہیں پیدا ہوجاتا' چنانچہ اس کے ثبوت میں فرنچ قوم کو پیش کیا جاسکتا ہے' جس کے جذبات و احساسات میں پوری دس صدیوں کے بعد اتحاد پیدا ہوا ہے' اور اب تمام قوم کے قالب میں ایک روح نظر آتی ہے' بایں ہمہ یہ عمل تولید اب تک

مکمل نہیں ہوا ہے' اور شورش فرانس کا بڑا سبب اسی خمیر کی خامی ہے گزشتہ زمانہ میں ملک فرانس مختلف فرقوں کا مرکز تھا' اور ہر گروہ کے خیالات و احساسات باہم نہایت مختلف تھے' اس بنا پر ایسی مختلف الاجناس قوم کو دفعتا" متحد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فرانس میں اکثر اوقات جو جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اس کا سبب بھی یہی ہے لیکن انگلستان میں یہ اتحاد درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے' وہاں ہر فرقہ ایک ہی رنگ مین ڈوبا ہوا نظر آتا ہے' اور اس امتزاج نے ان میں وہ اصول ثلاثہ پیدا کردیئے ہیں جن سے اس قوم کی روح پیدا ہوئی ہے' یعنی انگریزوں کا (۱) احساس عام ہے' (۲) ان کے فوائد عام ہیں (۳) ان کے عقائد عام ہیں' اور دنیا میں جب کوئی قوم اتحاد و امتزاج کے اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو خود بخود غیر محسوس طور پر تمام افراد اپنے فوائد میں متحد ہوجاتے ہیں' اور منازعات و مخاصمات کے اسباب کا قلع و قمع ہوجاتا ہے' جذبات' خیالات' عقائد' اور منافع عامہ کا اتحاد ایک ایسی چیز ہے' جو مزاج عقلی کے اتحاد کو مستقل اور پائدار بنادیتا ہے' اور اس کے ذریعہ سے ہر قوم تسلط عام حاصل کرلیتی ہے' قدیم زمانہ میں روما کو اسی کے بدولت عروج حاصل ہوا تھا' اور آج انگلستان اسی کے بدولت معراج کمال کو پہنچ گیا ہے' لیکن جب اتحاد کا یہ شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے تو قوم کی جمعیت بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ موروثی جذبات' خیالات' اور رسوم و عقائد' جن سے انسانی جماعت کی روح پیدا ہوتی ہے' ہر زمانہ اور ہر قوم میں موجود تھے' لیکن ان کو بتدریج ترقی حاصل ہوئی' اس روح کا مظہر اول خاندان تھا' پھر اس سے منتقل ہوکر وہ گاؤں میں پہنچی' گاؤں سے نکل کر اس نے شہر کو اپنا مرکز بنایا' پھر تمام ملک میں پھیل گئی' اور اب چند روز سے تمام دنیا کے قالب میں نظر آرہی ہے' چنانچہ اس زمانے میں وطنیت کا خیال اسی روح نے پیدا کیا ہے' کیونکہ جب تک یہ روح کامل نہیں ہوتی یہ خیال تاریکی میں چھپا ہوا رہتا ہے' یونان میں یہ روح صرف شہر تک محدود تھی اور ملک کا ہر فرد دوسرے سے بیگانہ تھا' اسی بنا پر وہاں وطن پرستی کو ترقی نہیں ہوئی اور ملک میں ہمیشہ جنگ و خونریزی کا بازار گرم رہا' اسی

طرح ہندوستان میں بھی دو ہزار برس سے دیہاتوں کے سوا کوئی عام ملکی اور قومی اتحار نہیں پیدا ہوا' اس لئے وہ اس زمانے سے آج تک غیر قوموں کا جولا نگاہ بنا ہوا ہے' ہر قوم اس میں نہایت آسانی سے حکومت کرلیتی ہے' اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے نکل بھی جاتی ہے' شہریت کا اتحاد اگرچہ جنگی قوت کے لحاظ سے ضعیف ہوتا ہے' اور شہریت کی روح اگرچہ بہ نسبت وطنیت کی روح کے محدود ہوتی ہے' تاہم تمدنی ترقی پر اس کا نہایت گہرا اثر پڑتا ہے' چنانچہ زمانہ قدیم میں ایتھنز اور قرون وسطی میں فلارنس اور روما میں اس روح کے تمدنی نتائج کا جلوہ نظر آسکتا ہے' جب چھوٹے چھوٹے شہروں اور ملکوں پر ایک طویل زمانہ گزر جاتا ہے' اور وہ باہم ایک دوسرے سے علیحدہ اور بے تعلق رہتے ہیں تو ان میں ہر ملک اور ہر شہر کی ایک مستقل اخلاقی روح پیدا ہوجاتی ہے جو دوسرے سے اس قدر مختلف اور بے میل ہوتی ہے کہ ان کی باہمی ترکیب و امتزاج سے ایک متحدہ قومی روح نہیں پیدا ہوسکتی' اگر کبھی موانع و عوائق کے فقدان سے ایسا ممکن بھی ہوتا ہے' تو یہ عمل ترکیبی چند دنوں میں مکمل نہیں ہوتا' بلکہ اس کے لئے ایک زمانہ دراز کی ضرورت ہوتی ہے' اور وہ دشوار (۲) اور بسمارک جیسے مدبرین کا محتاج ہوتا ہے' بعض حالتوں میں اگرچہ استثنائی اسباب کے اثر سے بعض ملک (مثلاً" اٹلی) دفعتاً" ایک متحدہ سلطنت کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں' لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ انھوں نے اس انقلاب کے ذریعہ سے اپنے اندر کوئی مشترکہ قومی روح بھی پیدا کرلی ہے' یہی وجہ ہے کہ ہم اٹلی میں مختلف فرقوں کو دیکھتے ہیں' جن کا انتساب خاص اپنے وطن کی طرف ہوتا ہے' لیکن ہم کو وہاں خالص اٹالین نظر نہیں آتے۔

ہر وہ قوم جو شاندار تمدن اور قدیم تاریخ کا سرمایہ رکھتی ہے' جب تک اس کی حالت میں توحید و یکرنگی نظر آئے اس کو مصنوعی یا تاریخی قوم کا لقب دینا موزوں ہوگا' زمانہ موجود میں بجز وحشی ممالک کے فطری اور نیچرل قوموں کا وجود نظر نہیں آتا' ہم کو صرف وحشی ممالک ہی میں خالص اور بے میل قوم نظر آسکتی ہے' یہ تمام متمدن قومیں بالکل تاریخی اور مصنوعی قومیں ہیں' لیکن ہم کو

فطری اور مصنوعی قوموں کے تفریق کی ضرورت نہیں ہمارا موضوع بحث دونوں کو شامل ہے۔ ہم صرف ان اوصاف سے غرض رکھتے ہیں جو ہر قوم میں ایک طویل زمانے کے بعد پیدا ہو جاتے ہیں' اور چند صدیوں کے بعد ایک ایسی مستقل صورت اختیار کرلیتے ہیں جو ہر قوم کو دوسرے سے ممتاز کردیتی ہے۔

حواشی

(۱) یعنی وہ حالت جس میں انسان کے جذبات' خیالات اور اعمال کا ظہور اضطراری طور پر بلا قصد و ارادہ ہوتا ہے۔

(۲) Rosseow

دوسری فصل

کسی قوم کے اخلاق میں کہاں تک تغیر پیدا ہو سکتا ہے؟

بظاہر یہ ایک قاعدہ مستمر معلوم ہوتا ہے' کہ ہر قوم کے اخلاق بدلتے رہتے ہیں' اس خیال کے پیدا ہونے کا سبب' خلق اصلی کا قرار و ثبات اور خلق ثانوی کا تغیر' انسانی اوصاف نفسیہ کا مقابلہ' حیوانات کے قائم رہنے والے اور بدلنے والے اوصاف سے' آب و ہوا' واقعات تاریخی اور تربیت کا اثر صرف دوسری قسم کے اوصاف نفسیہ تک محدود رہتا ہے' ان اوصاف کے تغیرات مختلف زمانوں کے لحاظ سے اور اس کی مثالیں' زمانہ انقلاب کے اعاظم رجال' ان کا حال دوسرے زمانوں میں کیا ہوتا؟ شورش کے بعد قومی اوصاف کیونکر قائم رہتے ہیں؟ اس کی مثالیں۔ خلاصہ۔

اگرچہ تمدنی انقلاب کی تاریخ کے دقیق مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قوم کا عقلی مزاج' نہایت راسخ' مستحکم اور پائدار ہوتا ہے' لیکن بظاہر ثبات و استقلال کے بجائے اس میں ہمیشہ تغیر و تبدل نظر آتا ہے' چنانچہ لوگوں نے تاریخ کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہے' ان کو بعض اوقات قوموں کی روح میں ایک تند تیز' اور عظیم الشان تغیر اور انقلاب محسوس ہوتا ہے' تمام دنیا یقین کرتی ہے کہ انگریزوں میں اب وہ اخلاق و عادات نہیں پائے جاتے' جو کرامویل (۱) کے زمانے میں

پائے جاتے تھے' اس زمانے کا حیلہ جو اور خائف اٹالین' قدیم زمانے کے جنگجو اور دفعتاً" ٹوٹ پڑنے والے اٹالین سے کس قدر مختلف ہے؟ اس انقلاب کی سب سے زیادہ واضح مثال فرانس ہے' جہاں چند سالوں کے درمیان نظام اخلاق میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہوگیا ہے' جن فرقوں نے شورش فرانس کے زمانے میں سبعیت' اور بہیمیت کی بدترین مثال دنیا کے سامنے پیش کی تھی' وہ اب بھی موجود ہیں' لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اخلاقی قالب بالکل بدل گیا ہے' لیکن اس اخلاقی انقلاب کے علل و اسباب کی تفصیل سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مادی انواع کی طرح انواع نفسیہ بھی صرف چند اساسی' مستحکم اور پائدار اخلاق اوصاف کی ترکیب و امتزاج سے بنتی ہیں' لیکن ان اساسی اوصاف کے بالمقابل دوسرے اوصاف ہوتے ہیں' جن میں خاص طور پر انقلاب و تغیر کی قابلیت پائی جاتی ہے' یہی اوصاف ہیں' جن میں زمانہ کی گردش انقلاب پیدا کرتی ہے' ورنہ اصلی اور اساسی اخلاق میں کبھی کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا ہوتا' اس کو ایک مادی اور واضح مثال میں یوں سمجھنا چاہئے کہ بیل کی ظاہری حالت گھاس اور چارہ سے بالکل بدل دی جاسکتی ہے' نباتات میں باغبان حکمت عملی سے اس قدر تغیرات پیدا کرسکتا ہے' کہ ان کی اصل حقیقت مشتبہ ہوجاتی ہے' بااین ہمہ ان کے نوعی یعنی اساسی اوصاف میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا ہوتا اور وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہتے ہیں' تغیر جو کچھ ہوتا ہے دوسرے قسم کے اوصاف میں ہوتا ہے' بعینہ اسی طرح ہر قوم کے اساسی اخلاق میں کسی قسم کا تزلزل نہیں واقع ہوتا' زمانہ بدلتا جاتا ہے' نئی نسل پیدا ہوتی جاتی ہے' ظاہری و باطنی اسباب اثر ڈالتے رہتے ہیں' لیکن اخلاق کا یہ سنگ بنیاد اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا' تغیر و تبدل جو کچھ ہوتا ہے' ان اوصاف ثانویہ میں ہوتا ہے' جن کا ہیولی خاص طور پر تغیرات کے لئے آمادہ رہتا ہے' تعلیم و تربیت' آب و ہوا' انقلاب زمانہ' غرض دنیا کے تمام اسباب صرف انہی اوصاف پر اثر کرتے ہیں' اور وہی ان کے اثرات کا مظہر ہیں لیکن اس موقع پر اس نکتہ کو یاد رکھنا چاہئے کہ مزاج عقلی اپنے اندر اخلاقی تغیرات کی ایک ایسی مخفی قابلیت رکھتا ہے' جو اکثر اوقات اگرچہ حالات کی

نامساعدت سے ظاہر نہیں ہوتی' لیکن جب موافق حالات جمع ہوجاتے ہیں' تو اس کا ظہور ہوتا ہے' اور اس وقت قوم ایک نئے قالب میں دنیا کے سامنے نمایاں ہوتی ہے' تاہم جس طرح طوفان سے دریا کی سطح میں ایک غیر معمولی عارضی حرکت پیدا ہوکر چند گھنٹوں میں ٹھہرجاتی ہے' اسی طرح قومی اخلاق کا یہ انقلاب بھی فوری اور وقتی اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ مذہبی اور سیاسی انقلابات کے زمانے میں تمام قوم ان عجیب و غریب اوصاف کا مظہر بن جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا قومی نظام اخلاق بالکل بدل گیا ہے اور اس کے افکار و خیالات نے عظیم الشان انقلاب کی صورت اختیار کرلی ہے' لیکن جب آندھی تھم جاتی ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ محض عارضی تغیر تھا جو دم کی دم میں فنا ہوگیا' جو لوگ مذہبی اور سیاسی انقلابات کے علم بردار ہوتے ہیں' ہم کو ان کا خمیر' ان کا عنصر' ان کا آب و گل' خود اپنے خمیر' اپنے عنصر' اور اپنے آب و گل سے مختلف و مبائن نظر آتا ہے اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر ہم اپنے آپ کو ان کی ناخلف اولاد سمجھتے ہیں' لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ان غیر معمولی اسباب کا نتیجہ تھا جو نظام اخلاق کو دفعتاً" بدل دیتے ہیں' ورنہ فطرۃ" وہ لوگ بھی ہماری ہی طرح قوم کے معمولی افراد تھے' جو اخلاقی قابلیت ان میں تھی وہی ہم میں بھی ہے' صرف فرق یہ ہے کہ انھوں نے اس اخلاقی نمائش کے لئے موافق زمانہ پایا تھا' اور ہم اس سے محروم ہیں' شورش فرانس کے زمانہ میں ایک بے رحم و سنگدل فرقہ پیدا ہوگیا تھا جو بات بات پر لوگوں کو سخت سزائیں دیتا تھا' لیکن درحقیقت یہ لوگ متوسط طبقے کے امن پسند شہری تھے' اگر شورش کا زمانہ نہ ہوتا تو وہ بھی ہماری طرح اطمینان و سکون کے ساتھ زراعت' تجارت' اور صنعت و حرفت میں مصروف رہتے لیکن غیر معمولی واقعات نے ان کے نظام عصبی میں غیر معمولی حرکت پیدا کردی' اس لئے انھوں نے ایک ایسی خوفناک صورت میں اپنے آپ کو نمایاں کیا جس کے تصور سے بھی ہم عاجز ہیں' اگر رو بسپیر (۲) اپنے زمانے کے سو سال بعد پیدا ہوا تھا تو نہایت متدین' اور صلح پسند' جج ہوتا' اسی طرح اگر سینٹ جنٹ (۳) ہمارے زمانے میں ہوتا تو ایک

بہت بڑا پروفیسر ہوتا جو علمی انجمنوں کے تمغوں پر ناز کرتا' چنانچہ نپولین کے زمانے میں جب یہ اعصاب کی متزلزل کرنے والی آندھی رک گئی تو اس نے اس درندہ صفت فرقہ کو اپنے مدبرانہ طرز عمل سے مزدور' محرر' تحصیلدار اور جج بنادیا' لیکن شورش' بدامنی' اضطراب' اور ابتلاء و امتحان کے زمانے میں بھی کسی قوم کے اساسی اخلاق میں تغیر و تبدل نہیں پیدا ہوتا' زیادہ سے زیادہ یہ فرق پیدا ہوجاتا ہے کہ ان اخلاق کے مظاہر بدل جاتے ہیں' مثلاً" انقلاب پسند لوگ جب قدیم استبدادی نظام حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں تو ایک ایسا نظام حکومت قائم کرتے ہیں جو حکام کے تمام امتیازات و اختیارات کو سلب کرلیتا ہے' اس وقت بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جبر و استبداد کا خاتمہ کردیا ہے' لیکن ایک مطلق العنان گروہ کو بالکل دست شل بنا دینا بھی استبداد ہی کی دوسری صورت ہے' اور اس جمہوری نظام میں بھی استبداد ہی کی روح پائی جاتی ہے اس لئے اس حالت میں بھی وہی قدیم نظام قائم رہتا ہے صرف اس کا قالب بدل جاتا ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شخصیت و استبداد قوم کے رگ و پے میں سرایت کرگئی ہے' اور اس کی روح کا ایک جزو بن گئی ہے' اسی روح کی برکت سے نپولین نے فتوحات کے ذریعہ سے لوگوں پر شخصی حکومت کی' چنانچہ اس نے جمہوریت فرانس کو اپنے رعب و اقتدار سے بالکل بدل دیا' تو قوم کے موروثی خلق یعنی شخص پرستی کا شدت کے ساتھ ظہور ہوا' یہاں تک کہ اگر وہ حاکم مطلق نہ بن گیا ہوتا' تو کوئی دوسرا شخص اس کے جھنڈے کو بلند کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا' چنانچہ پچاس سال کے بعد جب اس کے ہم نام نپولین نے استبدادی نظام کو قائم کیا تو تمام لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے اس شوق کے ساتھ جمع ہوگئے کہ گویا آزادی سے گھبرا کر غلامی پر ٹوٹے پڑتے ہیں' اس بنا پر درحقیقت انقلاب نے نپولین کی حکومت کا منارہ نہیں بلند کیا بلکہ قوم کی اس شخص پرست روح نے جو اس کے پائے آہنی کے سامنے سر بسجود ہوگئی تھی۔

انسان پر آب و ہوا' اور جغرافیانہ حالات کے اختلاف کا اثر شدت کے

ساتھ صرف اس بنا پر پڑتا ہے کہ اس نے انسان کے وہ اخلاق و عادات متاثر ہوتے ہیں، جن میں فطرتاً" تغیر و تبدل کی صلاحیت ہوتی ہے اور جن کو صحیح طور پر اساسی اخلاق کا حریف مقابل کہا جاسکتا ہے، لیکن اصلی اخلاق میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا، چنانچہ ایک امن پسند اور صاحب وقار آدمی بھی جب بھوک کی شدت سے بیتاب ہوگا تو گو وہ حالت اضطراب میں اپنے ہم جنسوں کو پھاڑ کھانے کے لئے دوڑے گا، لیکن بااین ہمہ اس عارضی حالت میں کوئی شخص یہ نہیں کہ سکتا کہ اس کی اصلی فطرت بدل گئی۔

جب کسی ملک میں تمدن دو متضاد گروہ پیدا کردیتا ہے، یعنی ایک دولت کی بہتات سے شب و روز عیش و طرب میں مصروف رہتا ہے، اور دوسرے گروہ کے پاس ضروریات زندگی کے پورا کرنے کا سامان بھی نہیں ہوتا، تو اس وقت ملک میں بددلی، بے چینی اور مختلف قسم کی شورش پیدا ہوتی ہے، لیکن ان انقلابات کے تہ میں بھی قوم کے اساسی اخلاق کی جھلک صاف نظر آتی ہے، چنانچہ ولایات متحدہ امریکہ کے انگریزوں نے وہاں کی خانہ جنگی کے زمانہ میں عزم و استقلال کی جو مثال قائم کی تھی، وہی مثال اب شہروں کے آباد کرنے، یونیورسٹیوں کے بنانے، اور کارخانوں کے چلانے میں دنیا کے سامنے پیش کررہے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اساسی اخلاق میں کبھی تغیر نہیں ہوتا، صرف اس کے مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔

حاصل یہ کہ اگر ہم مزاج عقلی کے تمام موثرات کو پیش نظر رکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ ان سے صرف وہ اخلاق متاثر ہوتے ہی جو اساسی اخلاق کے حریف مقابل ہیں ۔ خود اساسی اخلاق میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا اگر اساسی اخلاق میں کوئی تغیر ہوتا بھی ہے، تو اس کا ظہور ایک طویل زمانے کے بعد ہوتا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قوم کے اخلاق نفسیہ میں تغیر و تبدل کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ قوم کی جسمانی ترکیب، رنگ، روپ، ڈیل ڈول، اور خط و خال کی طرح وہ نہایت مستحکم اور پائدار ہوتے ہیں اور اسی پائداری کی بنا پر کسی قوم کا نظام اخلاق مدتوں کے بعد بدلتا ہے

حواشی

(۱) Hromell نہایت مشہور انگریزی جنرل تھا' رعایا نے جب چارلس کے خلاف بغاوت کی تو ۱۶۴۲ء میں اس کا سرغنہ اور اسی وقت سے شاہی فوج کو شکست ہونا شروع ہوئی' چند سال تک گویا عملاً" اس کی حکومت رہی ۱۶۵۸ء میں وفات پائی۔

(۲) Robepicere شورش فرانس کا ایک مشہور لیڈر

(۳) ST.JANT یہ انقلاب فرانس کا مشہور بانی تھی' اور خود باغیوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوا'

تیسری فصل

قوموں کے طبقات نفسیہ

تقسیم طبعی کی طرح قوموں کی تقسیم نفسی کا دار و مدار بھی چند غیر متبدل اوصاف پر ہے' قوموں کی تقسیم نفسی' ابتدائی قومیں' اقوام غیر متمدنہ' اقوام متوسطہ' اقوام متمدنہ' وہ عناصر نفسیہ جن پر اس قسم کا دارمدار ہے' خلق۔ ادب۔ یہ بحث کہ عقلی اوصاف تربیت سے بدل سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ کہ کسی قوم کے اخلاقی اوصاف نہیں بدل سکتے۔ تاریخ پر ان اوصاف کا اثر۔ اس امر کا سبب کہ مختلف قومیں ایک دوسرے کی حقیقت کو نہیں سمجھتیں اور نہ باہم ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں' اس امر کا سبب کہ کیوں متمدن و تہذیب غیر متمدن قوموں میں منتقل نہیں ہوسکتے۔

تاریخ طبعی کی کتابوں میں انواع کی جو تقسیم کی گئی ہے' اس کا دارومدار صرف ان اساسی اوصاف پر ہے' جن کی تعداد نہایت قلیل ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ علمائے طبیعات نے تقسیم انواع میں صرف ان اوصاف کا لحاظ رکھا ہے' جو غیر متبدل ہیں' ان کے سوا دوسرے درجہ کے تمام بدلنے والے اوصاف کو بالکل نظر انداز کردیا ہے' اوصاف نفسیہ کے لحاظ سے بھی اقوام کی تقسیم اسی اصول پر کی جاسکتی ہے' چنانچہ اگر ہم ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ' اور ایک قوم کا دوسری قوم کے ساتھ' اخلاقی موازنہ کریں' تو ہم کو ان کے اخلاق و

عادات میں عظیم الشان فرق نظر آئے گا، لیکن اگر ہم صرف اساسی اخلاق کو پیش نظر رکھیں تو گو اس فرق و امتیاز کا دائرہ بالکل تنگ ہو جائے گا، لیکن ہم آگے چل کر متعدد مثالوں سے ثابت کردیں گے کہ قوموں کی زندگی کا دارومدار صرف انہی قلیل التعداد اوصاف پر ہے۔

ان اوصاف کے لحاظ سے اگرچہ قوموں کی تقسیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہر قوم کے اوصاف نفسیہ کی تفصیل کی جائے، لیکن اس بحث کے لئے ضخیم جلدوں کی ضرورت ہوگی، اس بنا پر ہم نے اختصار کی غرض سے اس طریقہ کو کلی طور پر بیان کیا ہے۔

عام اخلاقی اوصاف کے لحاظ سے قوموں کی تقسیم چار قسموں میں کی جاسکتی ہے۔

(۱) ابتدائی قومیں۔ (۲) اقوام غیر متمدنہ۔ (۳) اقوام متوسطہ۔ (۴) اقوام متمدنہ۔

(۱) ابتدائی قوموں سے وہ قومیں مراد ہیں، جو تعلیم و تہذیب سے بالکل بے بہرہ ہیں، اور ان کی زندگی جانوروں سے مشابہ ہے، انسانی زندگی کا یہ وہ دور ہے جو ہمارے آباؤ اجداد پر عصر حجری (۱) میں گزر چکا ہے، اور اس زمانہ میں فیجی (۲) اور آسٹریلیا میں بھی اس قوم کے نمونے نظر آتے ہیں۔

(۲) اقوام غیر متمدنہ کی اخلاقی سرحد بھی انہی قوموں سے ملی جلی ہوئی ہے۔ اس کی نمایاں مثال حبشی لوگ ہیں، جن میں تمدن و تہذیب کی جھلک ضرور موجود ہے، لیکن صرف جھلک ہی جھلک ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، ان کی تاریخ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے وحشیانہ تمدن کے آگے کبھی قدم نہیں رکھا، اور اگر بہت زیادہ اونچے اڑے تو کبھی کبھی غیر قوموں کے خوان تمدن کی زلہ ربائی کرلی۔

(۳) اقوام متوسطہ میں چینی، جاپانی، ترک، عرب، اور یہود وغیرہ شامل ہیں۔ ان قوموں نے اس قدر عظیم الشان تمدنی ترقی کی ہیں کہ یورپ کی متمدن قوموں کے سوا کوئی قوم ان سے آگے بڑھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

(۴) اقوام متمدنہ میں صرف انڈو یورپین (آرین) قوموں کو شمار کیا جاسکتا ہے' صرف یہی ایک ایسی قوم ہے جس نے اختراع و ایجاد' صنعت و حرفت' اور علوم و فنون میں اپنے کمال کا اظہار کیا ہے' زمانہ قدیم یعنی یونان اور روما کے دور ترقی میں بھی وہ تمدن و تہذیب میں نمایاں تھی' اور آج بھی نمایاں ہے' آج تمدن کو اس درجہ تک اسی قوم نے پہنچایا ہے' اور نجار و کھرباء کی تحقیق و انکشاف اسی کا کارنامہ ہے' اس قوم میں سب سے کم ترقی یافتہ ہندی نسل ہے' لیکن اس نے بھی فنون لطیفہ' لٹریچر' اور فلسفہ میں اس قدر ترقی کرلی تھی کہ ترک' چینی' اور عرب اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

اخلاقی اور عقلی اوصاف کے لحاظ سے اگرچہ یہ چاروں قومیں باہم اس قدر مختلف ہیں کہ ان کو بیک نگاہ پہچان لیا جاسکتا ہے' لیکن جب خود ان قوموں میں ہر قوم کو الگ الگ شاخوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے' تو سخت دِقت واقع ہوتی ہیں' مثلاً" انگریز' روسی اور اسپینی سب کے سب اگرچہ اقوام متمدنہ میں داخل ہیں' تاہم ہم کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کے درمیان عظیم الشان فرق مراتب موجود ہے' اس بنا پر جو شخص اس کو نمایاں کرنا چاہتا ہے' اس کا ضروری فرض یہ ہے کہ وہ الگ الگ ہر قوم کے نظام اخلاق پر بحث کرلے' لیکن ہم مثال کے طور پر صرف دو قوموں کو لیتے ہیں' اور ان کے ان اساسی عناصر اخلاق سے بحث کرتے ہیں' جن کے ذریعہ سے دو قوموں میں امتیاز کی جاسکتی ہے' ابتدائی اور غیر متمدن قوموں میں کم و بیش یہ وصف مشترک طور پر پایا جاتا ہے' کہ ان میں تعقل کا مادّہ نہیں ہوتا' یعنی ان میں یہ قدرت نہیں ہوتی کہ مستقبل و حال کے خیالات و محسوسات کے باہمی موازنہ و مقابلہ سے کوئی ایسا نتیجہ اخذ کریں جن کے ذریعے سے دو مختلف زمانوں کے حالات میں فرق نظر آئے' ہم کو اس کلیہ کی وضاحت کے لئے بہت زیادہ وحشی قوموں کے حالات کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ خود یورپ کی ادنی درجہ کی قوموں کا بھی یہی حال ہے' اس عقلی درماندگی کا سبب صرف یہ ہے کہ ان قوموں میں نقد و بحث کا مادہ بالکل نہیں ہوتا' اس لئے نہایت سرعت کے ساتھ ہر بات کی تصدیق کرلیتی ہیں' اس کے

بخلاف متمدن انسانوں میں خیالات کے انضباط' ان کی تنقید' اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا فطری ملکہ موجود ہوتا ہے۔

اسی طرح ہم کو اقوام غیر متمدنہ میں غور و خوض کا مادہ کم' اور تقلید کا مادہ زیادہ نظر آتا ہے' وہ عموماً" جزئیات سے غلط نتائج پیدا کرتی ہیں' وہ نتائج استقرائی کے اخذ کرنے میں کوتاہ نظر ہوتی ہیں' ان کی اخلاقی حالت ہر وقت بدلتی رہتی ہے' کام کرتے وقت جو کچھ ان کی سمجھ میں آجاتا ہے' وہی ان کا دستور العمل ہوتا ہے۔

انہی باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ تمام قوموں سے پیچھے پڑی ہوئی ہیں اور اس وقت تک اسی حالت میں رہیں گی جب تک ان میں جذبات پر حکومت کرنے کی صلاحیت نہ پیدا ہوجائے' یعنی جب تک وہ ایسا قوی ارادہ نہ پیدا کرلیں جو ان کے نفس کو قابو میں رکھ سکے' وہ ترقی نہیں کرسکتیں' کیونکہ یہی وہ درجہ ہے جہاں پہنچ کر ہر قوم نظام عمل کی حقیقت کو سمجھتی ہے' اعلیٰ مقاصد کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہے' اور تمدنی مدارج کو طے کرتی ہے' درحقیقت ہر قوم کے اخلاقی معیار کے قائم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ پتہ لگایا جائے کہ اس قوم میں جذبات و خیالات پر قابو رکھنے کی کس قدر قدرت ہے؟ گزشتہ زمانہ میں رومن اور موجودہ دور میں انگریزوں اور امریکن لوگوں میں جذبات کے قابو میں رکھنے کا فطری ملکہ شدت کے ساتھ موجود ہے' اور اسی ملکہ نے ان کو اس عظیم الشان تمدنی درجہ تک پہنچا دیا ہے۔

ہم بتاچکے ہیں کہ مزاج عقلی ان عناصر نفسیہ کے مجموعہ کا نتیجہ ہے' جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے' اور صرف اسی مجموعہ کے ارتقائی مدارج' اور اسی مزاج عقلی کو افراد و اقوام کا مابہ الامتیاز وصف قرار دیا جاسکتا ہے

ان عناصر نفسیہ میں بعض کا تعلق اخلاق سے' اور بعض کا دماغ یعنی ذہانت و طباعی سے ہوتا ہے' اگرچہ اقوام متمدنہ' دوسری قوموں سے' اخلاق' اور ذہانت دونوں میں ممتاز ہوتی ہیں' لیکن خود اقوام متمدنہ کے مختلف طبقات میں صرف اخلاق کے ذریعہ سے تفریق و امتیاز کی جاسکتی ہے' چونکہ یہ ایک نہایت اہم تمدنی

نظریہ ہے اس لئے ہم اس پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔

اخلاق کی تولید صرف چند عناصر مخصوصہ کے امتزاج و ترکیب سے ہوتی ہے، جن کو علم النفس کی اصطلاح میں احساس اور شعور کہتے ہیں۔ ان میں ملکات ارادیہ مثلاً" اقدام، عزم اور ضبط نفس، کو اخلاق کی تولید میں سب سے زیادہ دخل ہے، اخلاق کی تولید کا ایک موثر سبب ادب یعنی قدیم قومی نظام کا وہ احترام بھی ہے، جس پر قومی زندگی کا دارومدار ہے اور ہر قوم اپنی عملی زندگی میں اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی ہے، اگرچہ اس نظام کے اصول و قواعد زمان و مکان کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، لیکن جب وہ وراثت کے ذریعہ سے بالکل ملکہ فطری بن جاتے ہیں تب اس میں ثبات و استحکام پیدا ہوجاتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اگرچہ اوصاف عقلیہ میں کسی قدر تغیر پیدا ہوسکتا ہے، لیکن اخلاقی محاسن پر تربیت کا کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ سچ ہے کہ جو لوگ ضعیف القلب اور ضعیف الارادہ ہوتے ہیں، ان کے اخلاق پر تربیت کا اثر پڑجاتا ہے، لیکن اس قسم کی نرم اور اثر پذیر طبیعت صرف قوم کے افراد کی ہوسکتی ہے، خود قوم میں مجموعی حیثیت سے اس کا وجود نہیں پایا جاتا اور اگر کسی قوم میں اس اثر پذیری کا مادہ عام ہوجائے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ اس کے تنزل و انحطاط کا زمانہ ہے۔

علمی مسائل، اور عقلی انکشافات ایک قوم سے دوسری قوم میں نہایت آسانی کے ساتھ منتقل ہوجاتے ہیں اور اسی بناء پر علم، انسان کی ملکیت عام بن گیا ہے، جس میں کسی قسم کی روک ٹوک نہیں، لیکن ہر قوم کا برا بھلا اخلاق اسی قوم کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی تک محدود رہتا ہے، کیونکہ اس کی ترکیب ان مستقل عناصر سے ہوئی، جن کے ذریعے سے ہر متمدن قوم کا مزاج عقلی دوسری قوم سے ممتاز ہوجاتا ہے، خلق درحقیقت پتھر کی ایک چٹان ہے، جس پر طوفان خیز موجوں کے تھپیڑوں کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اور جس طرح انواع مادیہ میں مچھلی کے لئے تیرنا، چڑیوں کے لئے چونچ، درندوں کے لئے دانت، فصل ممیز کا کام دیتے ہیں اور ان میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہر قوم کا اخلاق بھی ان

کی فصل ممیز ہے جو کبھی نہیں بدل سکتی۔

ہر قوم میں انقلابات و تغیرات صرف اخلاق ہی کے ذریعہ سے ہوتے ہیں اور وہی ان کے مستقبل کا سنگ بنیاد رکھتا ہے' انسان جن چیزوں کو اپنے اعمال کی علت قرار دیتا ہے وہ درحقیقت علت نہیں ہوتیں بلکہ ان کی تہہ میں صرف اخلاقی روح کام کرتی ہے' لوگ اپنے عقیدہ کے موافق کہتے ہیں کہ "یہ کام بخت و اتفاق سے ہوگیا" "یہ مقصد خدا کی مہربانی سے بر آیا" یہ "بات تقدیر سے ہوگئی" لیکن یہ تمام خیالی چیزیں ہیں' ان کا اصلی سبب صرف اخلاقی روح ہے۔

قومی زندگی کی بنیاد صرف اخلاق ہی کے ستون پر قائم ہے' عقل اور دماغ کا حصہ اس میں بہت کم ہے' رومن قوم اپنے تنزل و انحطاط کے زمانے میں عقلی حیثیت سے اپنے آباؤاجداد کی بہ نسبت زیادہ طاقتور تھی' تاہم چونکہ اپنی آبائی وراثت یعنی اقدام' عزم' شجاعت' جانبازی غرض ان تمام اخلاق کو جن کے ذریعہ سے ان کے آباؤاجدا نے ترقی کی تھی' کھوچکی تھی' اس لئے بالاخر تنزل کے غار میں گر پڑی۔

اخلاق ہی کی استواری نے ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں کو ساٹھ ہزار انگریزوں کا غلام بنادیا ہے' حالانکہ عقلی حیثیت سے ہندوستان میں بہت سے لوگ ہیں جو انگریزوں کے دوش بدوش کھڑے ہوسکتے ہیں' بلکہ بعض کو فلسفیانہ مباحث میں ان پر ترجیح دی جاسکتی ہے' ہندوستان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ اخلاق ہی نے انگریزوں کو نو آبادیوں کی اس عظیم الشان سلطنت کا حاکم بنادیا ہے' جس کی نظیر سے دنیا کی تاریخ خالی ہے۔

جماعت انسانی کا نظام' مذہب کی بنیاد' سلطنتوں کا معیار' صرف اخلاق کی سطح پر قائم ہے عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں' تمام قومیں اخلاق ہی کے ذریعہ سے حس و حرکت کرتی ہیں' اور صرف غور فکر کرنے سے دنیا کا کام نہیں چلتا۔ (۳) لیکن ہر قوم اپنے مزاج عقلی کے موافق اپنا ایک خاص نظام زندگی مرتب کرتی ہے اور اس پر عمل پذیر ہوتی ہے' اس خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان پر اشیاء خارجی کا ایک خاص اثر پڑتا ہے اور اس مخصوص اثر کی بنا ہر اس میں ایک

خاص خیال اور ایک خاص احساس پیدا ہوجاتا ہے اور وہ اس کے لئے ایک خاص طریقہ عمل مقرر کردیتا ہے' جو ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے' جن کا مزاج عقلی اس سے مختلف ہے' اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ باہم مزاج عقلی میں اختلاف رکھتے ہیں وہ ایک دوسرے کی حقیقت سے واقف نہیں ہوسکتے۔

اخلاق کا یہی اختلاف قومی منافرت کا سنگ بنیاد ہے' اور جو لوگ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں جب تک ان کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہر قوم احساس' عقل' اور عمل میں دوسری قوم سے مختلف ہوتی ہے اور اس اختلاف کی بنا پر کوئی قوم دوسری قوم کی حقیقت کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتی' ان کا مطالعہ نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا' یہ سچ ہے کہ مختلف قوموں کی زبانوں میں بہت سے الفاظ مرادف ہوتے ہیں' لیکن اس اتحاد معنوی کے ساتھ یہ الفاظ ہر قوم کے دل میں جو جذبات و خیالات پیدا کرتے ہیں' وہ باہم مختلف ہوتے ہیں' قومی خیالات کے اختلافات کا صحیح اندازہ صرف اس شخص کو ہوسکتا ہے جو غیر قوموں کے ساتھ ایک مدت تک زندگی بسر کرے' ان کی زبان سیکھنے انہی کی سی تربیت پائے' ان خیالات سے واقف ہونے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ مختلف قوموں کے متمدن مرد اور عورت میں زنا شوئی کے تعلقات پیدا کئے جائیں' اس حالت میں عقلی حیثیت سے دونوں میں عظیم الشان فرق نظر آئے گا' یعنی عورت جس قدر تعلیمی ترقی کرتی جائے گی دونوں کے مصالح اور دونوں کے احساسات میں اشتراک و اتحاد پیدا ہوتا جائے گا لیکن معقولات کی ترتیب میں دونوں کا قیامت تک اتفاق نہ ہوگا' کیونکہ دونوں کے مزاج عقلی میں سخت اختلاف ہے' اس لئے اشیاء خارجی کا جو اثر ایک پر پڑتا ہے' وہ دوسرے پر نہیں پڑسکتا۔

مزاج عقلی کے اسی اختلاف کی بنا پر متمدن قومیں اپنے تمدن و تہذیب کو غیر متمدن قوموں میں منتقل نہیں کرسکتیں' جو لوگ دنیا میں صرف عقلی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ تعلیم اس مشکل کو حل کردے گی' تمام دنیا نے ان کی رائے کو قبول کرلیا ہے' لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ مضر اور اس سے زیادہ بے اثر کوئی خیال نہیں ہوسکتا' بے شبہہ ایک غیر متمدن آدمی اپنی

فطری قوت حافظہ سے یورپ کے تمام علوم و فنون پر حاوی ہو سکتا ہے' بے شبہہ ایک حبشی' یا ایک جاپانی نہایت آسانی کے ساتھ بیرسٹری کی سند حاصل کر سکتا ہے' لیکن بایں ہمہ اس پر علم و فنون کا صرف سطحی رنگ چڑھ سکتا ہے' جس سے اس کا مزاج عقلی متاثر نہیں ہو سکتا' اس لئے یورپین دماغوں کے غور و فکر کا طریقہ' بالخصوص یورپین اخلاق و عادات اعلی سے اعلی تعلیم بھی ان میں نہیں پیدا کر سکتی' کیونکہ وہ صرف وراثت ہی کے ذریعہ سے پیدا ہو سکتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ایک حبشی یا ایک جاپانی تمام ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد بھی اخلاقی حیثیت سے ایک معمولی یورپین کی بھی ہمسری نہیں کر سکتا' وہ دس برس کی مدت میں ان تمام علوم و فنون کو حاصل کر سکتا ہے' جن کو ایک انگریز حاصل کرتا ہے' لیکن وہ ہزار برس میں بھی عملی طور پر انگریز نہیں بن سکتا' یہی وجہ ہے کہ جب کوئی قوم آسانی کے ساتھ اپنی زبان' اپنے عقائد' اور اپنے نظام زندگی کو بدلنا چاہتی ہے تو یہ تغیر صرف ظاہری اور سطحی ہوتا ہے البتہ جب وہ پہلے اپنی قومی روح میں تغیر پیدا کر لیتی ہے تو ان چیزوں میں بھی حقیقی تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔

حواشی

(۱) یعنی وہ زمانہ جس میں انسان صرف پتھر کے آلات سے کام لیتا تھا۔

(۲) FIJI مجمع الجزائر فیجی بحر پاسفک میں آسٹریلیا کے قریب ہے اور وہاں انگریزی حکومت قائم ہے۔

(۳) علم النفس کے علماء کے نتائج اعمال کی بے اثری اور کمی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقات کو صرف عقلی مسائل تک محدود کر دیا ہے اور اخلاقی مباحث کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں' میری دانست میں صرف موسیو پولھان نے رسالہ اخلاق میں اخلاق کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے' اور بتایا ہے کہ صرف اخلاق ہی قوموں کے مزاج عقلی کو پیدا کر سکتا ہے' ایک اور عالم موسیو ریبو نے بھی چند اوراق میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے' وہ کہتا ہے کہ "عقلی انقلابات میں ذہانت دوسرے درجہ کا انقلاب ہے' اصلی سنگ بنیاد صرف اخلاق ہے' جب عقل غیر معمولی نشوونما حاصل کر لیتی ہے تو اکثر اخلاق کو فنا کر دیتی ہے" اس بنا پر اقوام نفسیہ کی بحث اور ان کے باہمی مقابلہ

میں ہمیشہ اخلاق کو پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ علم الخلاق کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا' وہ ہر قوم کی تاریخ کا ماخذ ہے اس سے ہر قوم کے مدبرین کو راہ ہدایت ملتی ہے'اور اگر یہ مشکل نہ ہوتی کہ کارخانوں میں اور کتابوں میں نہیں ملتا' بلکہ اس کی تحقیق کے لئے دفتر کے دفتر الٹنے پڑتے ہیں' اور مختلف قوموں کے حالات سے واقفیت حاصل حاصل کرنی ہوتی ہے تو درحقیقت یہ نہایت عجیب بات ہوتی کہ علماء نے آج تک اس فن کو مدون نہیں کیا بلکہ ہم کو علم النفس کے مصنفین جدید میں کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جس نے اس کی مزاولت کی ہو کیونکہ اب وہ پہلے مباحث کو چھوڑ کر علم التشریح اور فزیالوجی کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔

چوتھی فصل

قوموں کے افراد کے درمیان فرق مراتب

کوئی قوم جس قدر ترقی کرتی ہے' اس کے افراد میں اسی قدر فرق مراتب پیدا ہو جاتا ہے' غیر متمدن قوموں کے افراد قوائے عقلیہ میں مساوی الرتبہ ہوتے ہیں' قوموں کے فرق مراتب کا اندازہ صرف طبقہ اعلیٰ کے باہمی موازنہ سے ہوسکتا ہے۔ طبقہ متوسطہ کو اس میں دخل نہیں' اقوام و افراد کے درمیان تمدنی ترقی سے یہ فرق مراتب اور بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔ اس فرق مراتب کا نتیجہ' ان اسباب نفسیہ کی بحث جو اس فرق مراتب کی وسعت کو روک دیتے ہیں' متمدن اقوام کے افراد میں قوائے عقلیہ کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہوتا ہے' لیکن اخلاق میں یہ فرق کم نظر آتا ہے' قانون توارث ہمیشہ ترقی یافتہ افراد کو ایک معتدل قومی روش کی طرف لے جاتا ہے' علم تشریح کے وہ مشاہدات جن سے اقوام' افراد' اور انواع کے اس تدریجی فرق مراتب کی تائید ہوتی ہے۔

متمدن' اور غیر متمدن قوموں کے درمیان صرف نفسانی اور جسمانی امتیازات کی حد فاصل حائل نہیں ہوتی' بلکہ جو عناصر ہر قوم کی تکوین کا مایہ خمیر ہیں' ان میں بھی یہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ غیر متمدن قوموں کے تمام افراد یعنی مرد اور عورت دونوں کی عقلی سطح تقریباً" یکساں اور

ہموار ہوتی ہے' اور اسی وجہ سے ان میں وہ عام مساوات پائی جاتی ہے' جس کا خواب اس زمانے کے سوشلسٹ دیکھا کرتے ہیں' لیکن ترقی یافتہ قوموں کے افراد بلکہ انواع میں بھی اس حیثیت سے عظیم الشان فرق ہوتا ہے' لیکن ان قوموں میں بھی چونکہ تمدن کا اثر طبقہ متوسطہ پر کم پڑتا ہے' اس لئے وہ اس فرق و امتیاز کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا' بلکہ اس فرق مراتب کا اندازہ صرف قوم کے طبقہ اعلی کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔

چنانچہ چین' یورپ' اور ہندوستان کے طبقات عالیہ ہی میں یہ فرق مراتب زیادہ نظر آتا ہے' اور طبقہ متوسطہ میں اس کی خفیف سی جھلک پائی جاتی ہے

تمدن کو جس قدر ترقی ہوتی جاتی ہے' اسی قدر اس فرق مراتب کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے' بالخصوص اقوام متمدنہ کے افراد میں تو اس دائرہ کا محیط اور بھی زیادہ وسیع ہوجاتا ہے' اس لحاظ سے خلاف توقع تمدن انسان میں عقلی مساوات کی جگہ فرق مراتب و امتیاز پیدا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمدن کے زمانہ میں عقلی مشاغل کا میدان وسیع ہوجاتا ہے' اور روز بروز یہ وسعت بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو قوم یا طبقہ ان عقلی امور میں جس قدر زیادہ ترقی کرتا ہے' اسی قدر وہ دوسری قوموں سے ممتاز ہوتا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی صنعت کو لے لو تو وہ تم کو متمدن قوموں کے معمولی طبقہ میں ایک ایسی محدود شکل میں نظر آئے گی' جس سے ان کی عقلی قوت کو ترقی کا کوئی موقع نہیں ملتا بلکہ وہ روز بروز اور بھی ضعیف ہوتی جاتی ہے' آج سے سو برس پہلے وہ شخص بڑا صناع خیال کیا جاتا تھا جو گھڑی کے تمام پرزوں کو بنا سکتا تھا لیکن اس کی تمام عمر صرف انہی چند پرزوں کے تراشنے اور ان کے جلا دینے میں صرف ہوجاتی تھی' اور اس سے زیادہ اس کو عقلی ترقی کا موقع نہیں مل سکتا تھا' لیکن اس زمانے کے کارخانہ داروں' اور انجینئروں کو ان معلومات اور ان تمام اکتشافات سے واقف ہونا پڑتا ہے' جن کا آج سے سو برس پہلے وجود بھی نہ تھا' اس بنا پر مسابقت باہمی سے ان میں اولوالعزمی کا مادہ پیدا ہوتا ہے' اور ان کے ملکہ استنباط میں ترقی ہوتی ہے' جس کا لازمی نتیجہ ایک دائمی ترقی کی

صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مختلف اقوام کے اس فرق مراتب کو ٹاکوئل نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"تقسیم عمل کا قانون جس قدر وسیع اور عام ہوتا جائے گا، اسی قدر صناع کی قوت عملیہ ضعیف اور قوت عقلیہ قوی ہوتی جائے گی، اور دوسرے کا تابع ہوتا جائے گا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صنعت و حرفت کو اس زمانے میں ترقی ہوئی ہے، اور صناع تنزل کی طرف مائل ہیں، اور کاریگروں اور ان کے افسروں میں فرق بڑھتا جاتا ہے۔"

اگر تشبیہ و تمثیل کے ذریعہ سے اس فرق مراتب کو واضح کیا جاسکتا ہے، تو اس زمانے میں عقلی ترقی کے لحاظ سے متمدن قوموں کو ایک ایسے منارے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، جس کا بلند ترین حصہ گویا قوم کا طبقے اعلیٰ ہے، اور کم درجہ کے لوگ ضخامت کے لحاظ سے اس کا عظیم الشان ٹکڑا ہیں لیکن کنگرے کی چوٹی پر صرف علماء، فضلاء، موجدین، مخترعین، اور ماہرین علوم و فنون کی صورتیں نظر آتی ہیں، فضلاء کا گروہ اگرچہ قوم کی مجموعی تعداد کے لحاظ سے نہایت مختصر اور محدود ہوتا ہے لیکن تمدنی ترقی میں عقلی سطح کا معیار صرف اسی مختصر گروہ کو قرار دیا جاسکتا ہے، سینٹ سیمن (۱) نے کس قدر سچ کہا ہے۔

"اگر فرانس پچاس عالم، اور اس قدر کاریگروں اور زراعت پیشہ لوگوں کو کھودے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ اس نے تمام قوم کا سر کاٹ کے الگ رکھ دیا، اور تمام قوم قالب بے روح ہوگئی، لیکن اگر وہ سرکاری عہدہ داروں کو ضائع کردے تو خوش اخلاقی کی وجہ سے تمام فرانس کو اس کا رنج ضرور ہوگا لیکن اس سے ملک کو نہایت خفیف نقصان پہونچے گا۔"

بہرحال تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ قوموں کے مختلف طبقات میں یہ فرق مراتب نہایت سرعت کے ساتھ وسعت اختیار کرتا جاتا ہے اور اگر قانون توارث اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوتا تو طبقہ اعلیٰ اور طبقے ادنیٰ میں یہ فرق اس قدر نمایاں نظر آتا، جس قدر ایک یورپین اور حبشی بلکہ آدمی اور بندر

کے درمیان نظر آرہا ہے' لیکن یہ فرق مراتب عام طور پر اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ متعدد اسباب اس کی وسعت میں خلل انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اولاً" تو یہ فرق صرف قوائے عقلیہ میں نظر آتا ہے' نظام اخلاق یا تو کلیتاً" اس سے متاثر نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے' اس لئے قومی زندگی میں جس کا دارومدار صرف اخلاق پر ہے عام طور پر اس کی نمائش نہیں ہوتی' دوسرے یہ کہ اس زمانے میں جماعت اپنا نظام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر جماعت ان لوگوں سے سخت عداوت رکھتی ہے جو اس پر تفوق و امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ظن غالب تو یہ ہے کہ جب جماعت کا نظام مکمل ہوجائے گا تو وہ ان تمام قوائے عقلیہ کی بنیاد کو متزلزل کردے گی جو اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور جب یورپ میں سوشلزم کی حکومت قائم ہوجائے گی تو چند دنوں میں ان برگزیدہ لوگوں کا وجود بھی باقی نہ رہے گا' اس بنا پر یہ عقلی فرق مراتب علانیہ محسوس نہیں ہوتا' لیکن یہ دونوں سبب عارضی ہیں کیونکہ ان کو تمدن نے پیدا کیا ہے' جو خود ایک بدلنے والی چیز ہے' اس لئے یہ دونوں سبب بھی اس کے ساتھ ساتھ بدل سکتے ہیں' اس عقلی تفوق و امتیاز کا سب سے اہم' اور قدرتی سنگ راہ قانون وراثت ہے جو کبھی ان افراد کو بالکل فنا کردیتا ہے' جو طبقہ متوسطہ پر عقلی حیثیت سے تفوق و امتیاز رکھتے ہیں' اور کبھی ان کو کھینچ تان کے طبقہ متوسطہ کے برابر کردیتا ہے۔ چنانچہ قانون وراثت جن علماء کا موضوع بحث رہا ہے' وہ قدیم چیزوں کے مشاہدات سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عقلی حیثیت سے جو طبقہ بلند رتبہ ہوتا ہے وہ رفتہ رفتہ فنا ہوجاتا ہے' اور اکثر اس پر فنا کا دور نہایت سرعت کے ساتھ طاری ہوتا ہے' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو عقلی تفوق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی نسل ساحل فنا کے قریب آجاتی ہے' اور اگر فضلائے قوم کو معمولی درجہ کے افراد سے استحکام و نشوونما حاصل ہوتا تو سرے سے ان کا وجود ہی قائم نہ رہتا' چنانچہ اگر ہر طبقہ کے ممتاز ترین اشخاص کی ایک علیحدہ آبادی قائم کی جائے' اور ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہو' تو انکے ذریعہ سے ایک ایسی بدترین نسل پیدا ہوگی' جو لازمی طور پر چند دنوں میں فنا

ہوجائے گی، باغبان کی مصنوعی تدبیروں سے جن درختوں کو غیر معمولی نشوونما حاصل ہوجاتی ہے، وہ اگر اپنی اصلی قوت نمو پر چھوڑ دیئے جائیں تو یا فنا ہوجائیں گے یا اپنی اس متوسط حالت میں آجائیں گے جو ان کی نشوونما کی موروثی حد تھی، بعینہ یہی حال اس اعلیٰ طبقہ کا بھی ہے، جو تمام افراد پر عقلی حیثیت سے تفوق و امتیاز رکھتا ہے، وہ ایک مصنوعی گروہ ہے جو نہایت سرعت کے ساتھ فنا ہوسکتا ہے اور طبقہ متوسطہ نہایت آسانی کے ساتھ اس کو اپنے اندر جذب کرسکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر قوم کے افراد میں اگرچہ عقلی حیثیت سے نمایاں فرق نظر آتا ہے، لیکن اخلاقی حیثیت سے ان سب کی سطح یکساں ہوتی ہے، اور زمانے کے انقلابات اس چٹان کو مطلق جنبش نہیں دے ، اس لحاظ سے اگر ہر قوم کی تاریخ پر اخلاقی اور عقلی دونوں حیثیتوں سے نظر ڈالی جائے تو اس کی عقلی قدر و قیمت کا اندازہ صرف فضلاء کے ایک محدود گروہ کے ذریعہ سے کیا جاسکے گا، جو اسکے تمدن، تہذیب، اور علوم و فنون کا روح رواں ہوگا، لیکن پوری قوم کی قدر و قیمت کا معیار صرف طبقہ متوسطہ کو قرار دینا پڑے گا، کیونکہ قومی طاقت کا شیرازہ اسی گروہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، یہ ممکن ہے کہ تمام قوم اس عقلی گروہ سے بے نیاز ہوجائے، لیکن کوئی قوم اخلاق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اور اخلاق کا مظہر صرف طبقہ متوسطہ ہوتا ہے، اس لئے قومی زندگی کا دارمدار صرف اسی طبقہ پر ہے۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عقلی مراتب کو ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے، لیکن نظام اخلاق کی حالت ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اس کا تمام تر تعلق طبقہ متوسطہ کے ساتھ ہے، اس لئے وہ ہمیشہ متوسط حالت میں قائم رہتا ہے اور اس کو بتدریج ترقی ہوتی ہے۔

اخلاق اگرچہ تمام قوموں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، لیکن متمدن قوموں میں اخلاقی طاقت کے ساتھ جب علمی قوت کی بھی آمیزش ہوجاتی ہے تو ان دونوں کی ترکیب و امتزاج سے تمدنی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے لیکن اس

اختلاط و امتزاج کا اثر صرف تمدن ہی پر پڑتا ہے' اصل قوم اس سے متاثر نہیں ہوتی' اس لحاظ سے قوم کا اعلیٰ طبقہ ہمیشہ نیا اور پرانا ہوتا رہتا ہے' کیونکہ طبقہ متوسطہ جو تغیر و تبدل سے محفوظ رہتا ہے اس کو نیا اور پرانا بناتا رہتا ہے۔

تشریحی تحقیقات سے بھی اس فرق مراتب کا ثبوت ملتا ہے۔

بار بار کے مشاہدات اور تجربات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی عقل اور اس کی کھوپڑی کے حجم میں عظیم الشان تناسب پایا جاتا ہے' اگرچہ اس تناسب میں بعض افراد مختلف ہوتے ہیں لیکن اس کا وجود یقینی ہے۔

متمدن اور غیر متمدن قوموں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہو سکتی ہے' وہ صرف یہی نہیں ہے کہ متمدن قوموں کی کھوپڑیاں بڑی ہوتی ہیں' کیونکہ یہ تو معمولی درجہ کا فرق ہے' بلکہ ان دونوں قوموں میں اصلی فرق یہ ہے کہ متمدن قوموں کا مغز اور بھیجا غیر متمدن قوموں سے بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قوموں کے درمیان فرق مراتب افراد کے لحاظ سے ہوتا ہے' قوم کے مجموعہ سے نہیں ہوتا' کیونکہ غیر متمدن قوموں کے سوا مختلف قوموں کے افراد کی کھوپڑیوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

اگر ہم گزشتہ اور موجودہ زمانے کے انسانوں کی کھوپڑیوں کا موازنہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جس قوم کے افراد کی کھوپڑیوں کی ضخامت میں زیادہ فرق ہوتا ہے' وہی سب سے زیادہ متمدن ہوتی ہے' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمدن کی ترقی مساوات عقلی نہیں پیدا کرتی' بلکہ فرق و امتیاز پیدا کرتی ہے فزیکل مساوات صرف غیر متمدن قوموں کے افراد میں پائی جاتی ہے اور اس لحاظ سے وحشی قوموں میں بہت کم فرق مراتب پایا جاتا ہے' لیکن اس کاشتکار میں جو اپنی زبان کے تین سو الفاظ سے زیادہ نہیں جانتا' اور اس عالم میں اس زبان کے لاکھ الفاظ ازبر ہیں عظیم الشان فرق ہے۔

تمدن افراد میں جو فرق مراتب کر دیتا ہے' بعینہٖ وہی فرق مرد اور عورت میں بھی نظر آتا ہے۔ غیر متمدن قوموں میں عقلی حیثیت سے تقریباً" مرد اور عورت کی حالت یکساں ہوتی ہے اور یہی حالت متمدن قوموں کے کم درجہ

فرقوں کی بھی ہے۔ لیکن جس قدر تمدن ترقی کرتا جاتا ہے' فرق پیدا ہوتا جاتا ہے'' مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے' اس قدر مرد اور عورت کی کھوپڑیوں کے حجم میں فرق ہوتا جاتا ہے' یہاں تک کہ اگر دو ہم عمر' ہم وزن' اور مساوی القامت مرد اور عورت کی کھوپڑیوں کا مقابلہ کیا جائے' تب بھی یہ فرق محسوس ہوگا لیکن یہ فرق غیر متمدن قوموں کے مردوں اور عورتوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔

متمدن قوموں عورتوں کی کھوپڑی غیر مہذب قوموں کی عورتوں سے بہت کم بڑی ہوتی ہے' ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ فرانس کے مردوں کی کھوپڑی کا حجم روز بروز بڑھتا جاتا ہے لیکن وہاں کی عورتوں کی کھوپڑی قریب قریب چینی عورتوں کی کھوپڑی کے برابر اور نیوکالیڈونیا کی عورتوں کی کھوپڑی سے بہت کم بڑی ہوتی ہے۔

حاشیہ

ST.SIMON

پانچویں فصل

تاریخی قوموں کی پیدائش

تاریخی قومیں کیونکر پیدا ہوئیں؟ وہ کون سے حالات ہیں جو مختلف قوموں میں اختلاط پیدا کرکے ان کو ایک قوم بنادیتے ہیں؟ مختلف قوموں کے مجموعہ میں ہر قوم کے افراد کی تعداد' ان کی جسمانی اور اخلاقی حالت کے اختلاف کا اثر' اس جدید قوم کی تولید کا نتیجہ' جدید پیدا شدہ قوم کے انحطاط کا سبب اس تولید قومی سے جو روحانی اخلاق پیدا ہوتے ہیں ان کا عدم استقلال' یہ اخلاق کیونکر مستحکم اور پائدار ہوسکتے ہیں؟

قوموں کی یہ تولید ایک نئی قوم کی پیدائش اور تمدن کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہے' مختلف گروہوں کے نظام کی اہمیت' آب و ہوا اور جغرافیانہ حالات کا اثر' آب و ہوا اور جغرافیانہ حالات کا اثر صرف اس وقت پڑتا ہے' جب کوئی قوم اپنے دور تکوین میں ہوتی ہے' اور اس کے قدیم موروثی اخلاق کا شیرازہ درہم برہم ہوچکتا ہے' قدیم قوموں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا' مختلف مثالیں' یورپ کی اکثر تاریخی قومیں اپنے دور تکوین میں ہیں' اس کے سیاسی اور تمدنی نتائج' تاریخی قوموں کی پیدائش کا زمانہ سرعت کے ساتھ کیوں گزر جاتا ہے؟ اوپر گزر چکا ہے کہ اس وقت دنیا کی متمدن اقوام میں حقیقی قوموں کا وجود

نہیں ہے' اس وقت صرف تاریخی قومیں موجود ہیں' جو فتوحات' سیاست' ہجرت' اور اس قسم کے دوسرے مختلف اسباب کے اثر سے پیدا ہوگئی ہیں' اور اس لئے وہ مختلف الجنس اور مختلف الاصل افراد سے مرکب ہیں' اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مختلف قومیں باہم مل کر کس طرح ایک تاریخی اور متحد الاخلاق قوم بن جاتی ہیں' لیکن اس کے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ متعدد قومیں ایسی ہیں جو ایک ساتھ رہنے کے بعد بھی دوسری قوم سے بالکل الگ تھلگ رہتی ہیں' اور ان میں کسی قسم کا اختلاط و امتزاج نہیں پیدا ہوتا' مثلاً" جرمن' ہنگرین' اور سلافی قومیں باوجودیکہ آسٹریا کے زیر حکومت ایک ہی ملک میں زندگی بسر کرتی ہیں' لیکن ان میں ہر قوم دوسری قوم سے الگ ہے' اور ان میں آج تک کسی قسم کا میل جول پیدا نہیں ہوا' اسی طرح آئرش قوم اگرچہ انگلستان کی محکوم ہے۔ لیکن اس نے اپنی تمام قومی خصوصیات کو محفوظ رکھا ہے' اس کے بالکل برعکس نہایت پست درجہ کی قومیں' مثلاً" آسٹریلین' اور ٹسمانی (۱) وغیرہ متمدن اقوام میں جذب ہوتی جاتی ہیں' کیونکہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر غیر متمدن قوم مہذب قوموں کے میل جول سے فنا ہوجاتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کا اختلاط و اتحاد محض اتفاقی اجتماع کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستحکم اصول کا پابند ہے' جس کے لئے تین شرطیں لازمی ہیں۔

(۱) جن قوموں کی ترکیب و امتزاج سے ایک جدید قوم پیدا ہونے والی ہے' ان کے افراد کی تعداد میں بہت زیادہ تفاوت نہ ہونا چاہیے۔

(۲) ان کے اخلاق میں بہت زیادہ اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

(۳) ایک طویل زمانہ تک ان کو ایک ہی آب و ہوا میں زندگی بسر کرنی چاہیے۔

لیکن ان تمام شرائط میں پہلی شرط سب سے زیادہ اہم ہے' کیونکہ ہم کو صاف نظر آتا ہے' اور اگر چند یورپین ہجرت کرکے حبشیوں کے درمیان اقامت اختیار کریں تو وہ بالکل فنا ہوجائیں گے' ان کی اولاد کی رگوں میں یورپین خون کا

ایک قطرہ بھی باقی نہ رہے گا' اسی بنا پر بہت سی فاتح قومیں ان مفتوح قوموں کے اندر جذب ہوگئیں' جنکی تعداد فاتح قوم سے زیادہ تھی۔ اہل عرب مصر میں اپنے تمدن' اپنی صنائع' اور اپنی زبان کے بہت سے یادگار آثار چھوڑ آئے لیکن قلت تعداد کی وجہ سے وہاں اپنے خون کا ایک قطرہ بھی نہ چھوڑا۔

دوسری شرط بھی خاص' اہمیت رکھتی ہے' اگرچہ بظاہر دو مختلف الاخلاق قوموں میں اختلاط و امتزاج پیدا ہوسکتا ہے' یہاں تک کہ حبشی اور یورپین بھی باہم مل سکتے ہیں' لیکن اس حالت میں جو قوم پیدا ہوتی ہے وہ نہایت غیر متمدن اور غیر مہذب ہوتی ہے' نہ وہ خود کوئی تمدن پیدا کرسکتی' نہ کسی تمدن کو قائم رکھ سکتی' اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں قوموں کا یہ اختلاف دونوں کے نظام اخلاق کو درہم برہم کردیتا ہے' اس لئے وہ قوم جو اس قسم کے اجزاء مختلفہ سے پیدا ہوئی ہے ہے' جب کسی تمدن کی وارث ہوجاتی ہے' تو اس کو دفعتاً" برباد کردیتی ہے۔ چنانچہ سان دو مینج (۲) کے باشندوں کے حالات سے اس کی تائید ہوسکتی ہے' اس کے بخلاف اگر دو متمدن قوموں میں اخلاقی حیثیت سے تشابہ ہو تو ان کی ترکیب تمدنی ترقی کا سب سے قوی اور موثر سبب بن جاتی ہے' امریکہ میں جرمنوں اور انگریزوں کے اسی اختلاط نے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تمدن پیدا کردیا ہے' لیکن اگر دونوں قوموں میں اس قسم کی ہم رنگی نہ پائی جائے تو ان کے اختلاط سے بدترین نسل پیدا ہوتی ہے' یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں سپید اور سیاہ رنگ کے انسانوں کی مخلوط نسل زیادہ ہے ان میں ہمیشہ مطلق العنانی پائی جاتی ہے' اور صرف ایک پنجہ فولادی ہی ان کو قابو میں رکھ سکتا ہے' برازیل (۳) جس میں سپید رنگ کے انسانوں کی تعداد تہائی سے زیادہ نہیں' اس نتیجہ کو دنیا کے سامنے نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کرنے والا ہے' آگاسیز (۴) نے یہ بالکل صحیح رائے قائم کی ہے کہ

"قوموں کے اختلاط سے جو انقلاب پیدا ہوتا ہے' وہ ایک سیاح کو ناقابل انکار طریقہ پر برازیل میں ہر جگہ سے زیادہ نمایاں نظر آئے گا' یہ اتحاد آمیز اختلاط یورپین حبشی اور ہندو قوم کے تمام محاسن کو

یکساں طور پر برباد کررہا ہے' اور عقلی اور جسمانی حیثیت سے ایک ایسی کمزور نسل پیدا کررہا ہے' جو دائرہ بیان سے خارج ہے"

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا قومی اختلاط ہر قوم کے جسمانی اور عقلی مزاج کو بدل دیتا ہے' اور صرف وہی ایک ایسی چیز ہے اس کے ذریعہ سے قوم کے اصلی اخلاق میں تغیر پیدا کیا جاسکتا ہے۔

اخلاق ایک موروثی چیز ہے' اور وراثت کو صرف وراثت ہی زائل کرسکتی ہے۔ اس لئے جب دو قوموں کے امتزاج و اختلاط پر ایک زمانہ گزر جاتا ہے' تو اس کے اثر سے ایک جدید قوم پیدا ہوجاتی ہے' جو جسمانی اور روحانی اوصاف کے لحاظ سے بالکل ایک جدید قوم ہوتی ہے' ابتداء میں اس طریقہ سے اخلاق کی تولید بتدریج ہوتی ہے' اور اس کا اثر بہت کم ظاہر ہوتا ہے' لیکن جب اس طرح ایک زمانہ گزر جاتا ہے اور موروثی ہوجاتے ہیں تو ان میں استحکام پیدا ہوجاتا ہے' دونوں قوموں کے اختلاط کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں کی روح یعنی ان احساسات و خیالات کو فنا کردیتی ہے' جن کی تہ میں قومی قوت کا خزانہ چھپا ہوا رہتا ہے' اور جن کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی' قومی زندگی میں یہ زمانہ سب سے زیادہ سخت گزرتا ہے' کیونکہ نشوونما کا زمانہ ہوتا ہے' اور بچپن کی زندگی نہایت نرم و نازک ہوتی ہے' دنیا کی تمام قوموں پر یہ دور گزر چکا ہے' یورپ کی ہر قوم کا سنگ بنیاد دوسری قوموں کے کھنڈر پر رکھا گیا ہے' اور وہ اندرونی فرق و امتیاز' اور مختلف انقلابات کا مرکز ہے' اور جب تک جدید متحدہ نظام اخلاق مکمل نہ ہوجائے گا' یورپ میں یہ کش مکش قائم رہے گی۔

ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئی قوموں کی پیدائش اور پرانی قوموں کے زوال کا اصلی سبب مختلف قوموں کی یہی آمیزش ہے' اور اس لحاظ سے جو متمدن قومیں اپنے آپ کو اجنبیوں کی آمیزش سے الگ تھلگ رکھتی ہیں' وہ نہایت دور اندیش ہیں' اگر قومی تعصب نے آریوں کی قومیت کو محفوظ نہ رکھا ہوتا تو جس زمانہ میں (یعنی آج سے تین ہزار برس پہلے) ان کی ایک مختصر تعداد نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اسی وقت ان کا قومی نظام درہم برہم ہوجاتا'

اور وہ سیاہ فام قوم ان کو نگل گئی ہوتی جو چاروں طرف سے ان کا احاطہ کئے ہوئے تھی' اس لئے آج جزیرہ نمائے ہند میں تمدن کا وجود نظر نہ آتا' اگر انگریز اس معاملہ میں سہل انگاری سے کام لیتے تو ہندوستان سلطنت ان کے ہاتھ سے کب کی نکل چکی ہوتی' غرض یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنے تمام شخصیات کو کھودے' سخت ترین مصائب میں مبتلا ہوجائے' اور پھر اپنی قدیم مردہ قوتوں کو زندہ کرکے دوبارہ اپنی ہستی کو قائم کرلے' لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی روح کو فنا کرکے دوبارہ خواب مرگ سے بیدار ہوجائے۔

جب کسی قوم کے تمدن کو زوال ہونے لگتا ہے اور وہ طوعا"یا کرہا" جنگجو قوموں کا شکار بن جاتی ہے' تو اس وقت اس اختلاط کا اثر نمایاں ہوتا ہے' یعنی اس کا قدیم اخلاق فنا ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ جدید اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں' اب قدیم قومی روح کے فنا ہونے سے قدیم تہذیب کی بنیاد بالکل متزلزل ہوجاتی ہے اور جدید تمدن کے لئے میدان صاف ہوجاتا ہے۔

جب کوئی جدید قوم ان ادوار مختلفہ سے گزر کر اپنے دور تکوین میں داخل ہوتی ہے' تو تیسری شرط یعنی آب و ہوا اور مقامی خصوصیات کا اثر ظاہر ہوتا ہے' قدیم قومیں اگرچہ اس سے بہت کم متاثر ہوتی ہیں' لیکن جدید پیدا ہونے والی قوم پر ان حالات کا شدت کے ساتھ اثر پڑتا ہے' کیونکہ اس اختلاط کے ذریعہ سے اس کے قدیم اخلاق برباد ہوجاتے ہیں' اور جدید اخلاق کی نشوونما اور استحکام کے لئے راستہ صاف ہوجاتا ہے' اس لئے اس خالی زمین پر آب و ہوا اور جغرافیانہ حالات کا اثر نہایت آسانی کے ساتھ پڑ جاتا ہے' اور اس وقت ہر قوم کی پیدائش کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے' چنانچہ فرنچ قوم اسی طور پر پیدا ہوئی ہے' لیکن اس اثر میں مختلف حالات کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے' اور اسی وجہ سے اس کے متعلق علماء میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا ہے' لیکن ہماری رائے میں جو قومیں اپنے دور تکوین میں ہوتی ہیں' ان پر یہ اثر نہایت شدت کے ساتھ پڑتا ہے' اور جو قومیں قدیم اور موروثی اخلاق کی مالک ہیں ان پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔

اخلاقی حیثیت سے جغرافیانہ حالات کی بے اثری خود یورپین میں تمدن سے ظاہر ہوتی ہے' ایک مدت سے مشرقی قوموں کے ساتھ ہم کو اختلاط حاصل ہے' لیکن ہمارے تمدن نے ان پر مطلق اثر نہیں کیا چنانچہ جو چینی ولایات متحدہ میں اقامت گزیں ہیں ان کی اخلاقی حالت سے یہ بے اثری مشاہدہ نظر آتی ہے' مادی اور مقامی حیثیت سے بھی اس کا اثر بہت کم پڑتا ہے' یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم اجنبی ملک میں بہ مشکل زندگی بسر کرسکتی ہے' علانیہ نظر آتا ہے کہ جب کوئی آدمی' کوئی جانور' اور کوئی پودا اپنے وطن سے غیر ملک میں جاتا ہے تو فنا ہوجاتا ہے' تقریباً" دس قوموں نے مصر کو فتح کیا' اور وہ آج ان تمام قوموں کا مقبرہ بنا ہوا ہے' لیکن کوئی فاتح قوم وہاں اقامت گزیں نہ ہوسکی' وہاں یونانی' رومی ایرانی' عرب ترک سبھی آئے' لیکن کسی نے اس سرزمین میں اپنے خون کا ایک قطرہ نہ چھوڑا' مصر کی مقامی خصوصیات کا اصلی نمونہ صرف وہ کاشتکار ہے جس کا سیمائے سخن گو صاف بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی نسل سے ہے جن کی تصویریں سات ہزار برس سے ان کے درو دیوار پر مصر کی صناعی کا بہترین نمونہ پیش کررہی ہیں'

یورپ کی تمام بڑی بڑی تاریخی قومیں اب تک اپنے دور تکوین میں ہیں اور اس لئے انگریزوں کے سوا مغرب کی ہر قوم کا نظام اخلاق اب تک ناکمل ہے' صرف انگریزی قوم ایک ایسی قوم ہے' جس کے اخلاق مستحکم ہوچکے ہیں' چنانچہ برٹن' سکس' نارمنڈی' گروہ کی تمام اخلاقی خصوصیات مٹ گئی ہیں اور انکے بجائے ایک جدید متحدہ نظام اخلاق قائم ہوگیا ہے' فرانس کے مختلف طبقات میں اب تک نمایاں فرق و امتیاز موجود ہے' لیکن افسوس ہے کہ اس طبقہ کے خیالات اور اخلاق میں بھی فرق نظر آتا ہے' اور اس لحاظ سے کوئی ایسا جامع دستورالعمل بہ مشکل بنایا جاسکتا ہے' جو ہر ایک کے لئے موزوں ہو' اگر سلطنت کا زور نہ ہوتا تو وہ لوگ بہت سی عقلی باتوں میں بھی باہم متحد نہ ہوتے۔

اہل فرانس کے احساسات' معتقدات' اور سیاسیات میں جو اختلاف نظر آتا ہے' وہ مزاج عقلی کے اسی اختلاف کا نتیجہ ہے' لیکن ان تمام اختلافات کو صرف

زمانہ ہی کا پر زور ہاتھ مٹا سکتا ہے۔

جن قوموں میں باہم کش مکش پیدا ہوتی ہے' ان سب کا یہی حال رہ چکا ہے۔ انکے تمام منازعات و اختلافات کا سرچشمہ مزاج عقلی کا یہی اختلاف تھا' اس لئے جب ان قوموں کی نسل نے وسعت حاصل کی تو ان مختلف المزاج لوگوں کا ایک جھنڈے اور ایک قانون کے تحت میں رہنا سخت مشکل ہوگیا' دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے اس قسم کی مختلف المزاج قوموں پر حکومت کرنا چاہا ہے وہ خود مٹ گئے ہیں' تمام موجودہ قوموں میں صرف انگریزوں اور ہالینڈ کے باشندوں کے آگے ایشیاء کی مختلف قوموں نے اپنی اپنی گردنیں جھکادی ہیں' لیکن ان کو یہ کامیابی صرف اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ انھوں نے کسی قوم کے مذہب اور اخلاق سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا ہے بلکہ ان کو اس قسم کی آزادی عطا کی ہے' جس کی وجہ سے گویا وہ خود اپنے اوپر حکومت کر رہی ہیں' حکومت کا اثر ٹیکس' تجارت اور امن و امان تک محدود ہے' مذہب اور اخلاق پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے' لیکن مسامحت اور بے تعصبی کی ان مستثنیٰ اور قلیل الوجود مثالوں کے سوا کوئی ایسی عظیم الشان سلطنت جو مختلف قوموں پر مشتمل ہو' بجز قوت کے قائم نہیں رہ سکتی اور قائم ہونے پر بھی قوت کے زوال پذیری کے ساتھ ہمیشہ فنا ہوجانے کے خطرہ میں مبتلا رہتی ہے۔

ہر جدید قوم کے عناصر متحدہ میں جب تک بتدریج امتزاج نہ پیدا ہوجائے' جب تک ان میں ایک طویل اختلاط نہ ہو' جب تک وہ ایک آسمان کے نیچے مدتوں زندگی نہ بسر کرلیں' جب تک وہ ایک ہی قسم کی آب و ہوا سے اثر پذیر نہ ہوں' جب تک وہ ایک ہی نظام اور ایک ہی عقیدہ کی پابند نہ بنائے جائیں' اس وقت تک وہ قوم جدید قوم نہیں بن سکتی' لیکن جب یہ تمام باتیں جمع ہوجاتی ہیں تو ایک زمانہ کے بعد ان تمام اجزاء کی ترکیب سے ایک مستقل قوم پیدا ہوجاتی ہے۔

دنیا کی عمر جس قدر طویل ہوتی جائے گی اسی قدر ہر قوم کا رسوخ' و استحکام ترقی کرتا جائے گا' اور اختلاط واتحاد کے تدریجی اثر سے ان میں بہت کم تغیر پیدا

ہوگا' انسانیت جب اپنی زندگی کا ایک دور ختم کرلے گی' اس وقت موروثی موثرات کے اثر سے گرانبار نظر آئے گی اور اپنی اصلی حالت کا بدلنا اس کے لئے محال ہوجائے گا' اور اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کی تاریخی قوموں کا دور تکوین اب عنقریب گزر جانے والا ہے۔

حواشی

(۱) باشندگان ٹاسمانیہ' ٹاسمانیہ آسٹریلیا کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے جہاں انگریزوں کی حکومت ہے۔

(۲) اس نام کی تصحیح نہ ہوسکی

(۳) BRAZEL جنوبی امریکہ کی سب سے بڑی ریاست ہے نظام حکومت جمہوری اور ۱۷۰۰۰۰۰۰ کی آبادی ہے

(۴) اس نام کی تصحیح نہ ہوسکی۔

دوسرا باب

تمدنی عناصر میں قوموں کے اخلاق کا ظہور

پہلی فصل

تمدنی عناصر ہر قوم کی خارجی روح کے مظاہر ہیں

تمدن کے عناصر ہر قوم کی خارجی روح کے مظاہر ہیں' اقوام کے اختلاف سے ان عناصر کی اہمیت کا اختلاف' اس اہمیت کے لحاظ سے بعض اوقات فنون لطیفہ' آداب و رسوم وغیرہ کا قومی حیثیت سے پہلا درجہ ہوتا ہے' زمانہ قدیم میں مصری' یونانی' اور رومن قوموں کے ذریعہ سے اس کی مثال' فنون لطیفہ کے ذریعہ سے مثال' فنون لطیفہ کس چیز پر دلالت کرتے ہیں؟ تمدن کا صرف ایک عنصر تمدنی ترقی کی دلیل نہیں ہوسکتا' تمدن کے وہ عناصر جن کی ترقی کے کسی قوم میں بکثرت اسباب پیدا ہوگئے' یہ تمدنی عناصر بعض اوقات فلسفیانہ حیثیت سے نہایت کم درجہ رکھتے ہیں' لیکن اجتماعی حیثیت سے ان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

تمدن کے عناصر یعنی زبان' نظام سیاست' عقائد' خیالات' فنون لطیفہ اور لٹریچر ہر قوم کی روح کا مظہر خارجی ہوتے ہیں لیکن ہر قوم اور ہر زمانے میں وہ ایک ہی طریقہ سے اس پر دلالت نہیں کرتے' فنون لطیفہ میں آج جو کتابیں لکھی جاتی ہیں تقریباً" ان سب میں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ یہ تمام صناعیاں اس قوم

کے خیالات کی ترجمان ہیں، جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہے اور نیز یہ کہ انہی کے ذریعہ سے ان کے تمدن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بلا شبہہ اکثر اوقات واقعات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن اس کو کوئی کلیہ نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ کسی قوم کی عقلی ترقی کے لئے فنون لطیفہ کوئی لازمی چیز نہیں ہیں، دنیا میں بعض قوموں کی تمدنی ترقی کا دیباچہ زریں اگرچہ صرف فنون لطیفہ کو قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن بعض قومیں ایسی بھی ہیں جن کے اعلیٰ تمدن میں فنون لطیفہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے، اگر ہم ان تمام تمدنی عناصر میں صرف ایک ایک عنصر کے اعتبار سے ہر قوم کے تمدن کی تاریخ مرتب کرنا چاہیں، تو ہم کو ہر قوم کی تاریخ میں ایک خاص عنصر کو نمایاں کرنا پڑے گا، کسی کے ساتھ فنون لطیفہ کو تخصیص ہوگی، کہیں فوجی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں نظر آئیں گی، کہیں تجارت کی گرم بازاری کا تماشہ نظر آئے گا، غرض ہر قوم کا الگ الگ تمدنی کارنامہ قرار دینا پڑے گا، لیکن سب سے پہلے ہم کو اسی مسئلہ پر بحث کرنی چاہئے کیونکہ اس سے ان اسباب کا پتہ چل سکتا ہے جن کے ذریعہ سے تمدنی عناصر ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہوکر مختلف قالب اختیار کرلیتے ہیں اور ان میں نمایاں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔

تمدنی عناصر کی نشوونما کے لحاظ سے قدیم مصری اور رومن قوموں کے درمیان یہ فرق اس شدت کے ساتھ نظر آتا ہے کہ ایک ہی عنصر کی مختلف شاخوں میں یہ اختلاف محسوس ہوتا ہے، چنانچہ مصری قوم کی تمدنی ترقی میں لٹریچر اور نقاشی کا درجہ بالکل پست تھا، اور ان کی قوت اختراع صرف فن تعمیر، اور بت تراشی میں اپنا کمال دکھاتی تھی، اس زمانہ کو اہل مصر کی عظیم الشان عمارتوں پر ناز تھا، اور وہ ہمارے لئے فن بت تراشی کے بہت سے ایسے اعلیٰ ترین نمونے چھوڑ گئے ہیں جن کو اس فن کی ترقی کا ایک اعلیٰ معیار قرار دیا جاسکتا ہے (۱) یونانیوں نے بلاشبہہ ان پر اس حیثیت سے تفوق حاصل کرلیا تھا، لیکن اس تفوق کا زمانہ نہایت مختصر اور محدود تھا، مصریوں کی حریف مقابل صرف رومن قوم ہوسکتی ہے، جس نے تاریخ میں ایک یادگار زمانہ چھوڑا ہے۔ تقلید اور تتبع کے

لئے اس قوم کے سامنے فنون لطیفہ کے اعلیٰ ترین نمونے' اور اعلیٰ ترین مثالیں موجود تھیں اس کا زمانہ مصریوں اور یونانیوں کے زمانے سے بالکل قریب تھا' لیکن بایں ہمہ اس نے اپنے لئے کوئی خاص صنعت ایجاد نہیں کی۔ دنیا کی تمام قوموں میں فنون لطیفہ کی اختراعات کے لحاظ سے صرف رومن قوم سب سے زیادہ گمنام ہے' کیونکہ اس کو ان کے ساتھ مطلق اعتناء نہ تھا' اور وہ ان کی طرف صرف مالی فوائد کی غرض سے توجہ کرتی تھی' اس لئے ان کو سونا' چاندی' عطر اور مصالح کی طرح ایک تاجرانہ چیز سمجھتی تھی' وہ اگرچہ ترقی کی معراج کمال کو پہنچ گئی تھی' لیکن اس کی کوئی خاص ملکی صنعت نہ تھی' یہاں تک کہ جب اس کی سلطنت کو استحکام حاصل ہوگیا' مال و دولت کی بہتات ہوگئی' خود اس کو آرائش اور زیب و زینت کا شوق پیدا ہوگیا' اور اس ذریعہ سے اس کے وہ جذبات کسی قدر متاثر ہوئے' جو فنون لطیفہ کے بال و پر ہیں' تو اس عالم شوق میں بھی وہ یونانیوں کی دست نگر رہی' اور انہی کے نمونوں' اور انہی کے کاریگروں کے ذریعہ سے اس نے اپنے شوق کو پورا کیا' اس لحاظ سے اگر ہم روما کے فن تعمیر اور فن سنگ تراشی کی تاریخ لکھنا چاہیں تو وہ یونانی فنون لطیفہ کی تاریخ کی ایک فصل ہوگی' لیکن اسی قوم نے جو فنون لطیفہ میں اس قدر کم مایہ تھی تمدن کے دوسرے عناصر کو آسمان تک پہنچا دیا' اس نے ایک ایسا باقاعدہ فوجی نظام قائم کیا جس نے تمام دنیا کو اس کا حلقہ بگوش بنادیا' اس نے سیاست اور قضاءت کے وہ اصول قائم کئے جن کی ہم آج تقلید کررہے ہیں' اس نے ایک ایسا لٹریچر پیدا کردیا' جس سے ہم مدتوں سبق لیتے رہے' اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ تمدنی عناصر کی نشوونما متمدن قوموں میں مختلف طور پر ہوتی ہے اور اس لئے تمدن کو صرف ایک عنصر' (مثلاً" فنون لطیفہ) میں محدود کردینا سخت غلطی ہے' مصری قوم نے اگرچہ تمام فنون لطیفہ کو حد اعجاز تک پہنچادیا تھا' لیکن نقاشی اور لٹریچر میں اس کا درجہ نہایت پست تھا اسی طرح رومن قوم نے باوجودیکہ لٹریچر' نظام فوج' اور نظام سیاست کو دنیا کے سامنے نئے آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا تھا' تاہم فنون لطیفہ کی دوسری شاخوں میں اس نے بہت کم ترقی کی تھی۔

اس موقع پر یونانیوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ وہ ایک ایسی قوم ہے' جس نے تمدن کے مختلف عناصر کو نہایت ترقی دی تھی۔ ہومر کے زمانے میں یونانی فن ادب نے اس قدر قبول عام حاصل کیا تھا کہ اس کی نظمیں صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوان کے لئے آب حیات کا کام دیتی رہیں' لیکن آثار قدیمہ کی تحقیقات سے اس زمانے کی جو عمارتیں ظاہر ہوئی ہیں وہ بالکل وحشیوں کی عمارتوں سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں' اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانی طرز عمارت مصری اور اشوری طرز عمارت کا بگڑا ہوا خاکہ ہے۔

تمدنی عناصر کی نشوونما کا یہ اختلاف سب سے زیادہ ہندو قوم کے اندر نظر آتا ہے۔ ہندوؤں نے فن تعمیر کو اس درجہ تک پہنچا دیا تھا کہ دنیا کی کسی قوم میں اس کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے۔ اس نے فلسفہ کو اس قدر ترقی دی تھی کہ یورپ کہیں آج جا کر اس کے درجہ کو پہنچا ہے۔ فن ادب میں اگرچہ انھوں نے یونانیوں اور رومیوں کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا' تاہم ان کا لٹریچر اس قسم کے قطعات و قصائد کا کافی سرمایہ رکھتا ہے' جن پر بڑے بڑے انشاء پرداز ناز کرسکتے ہیں' لیکن بالکل اس کے برعکس وہ مصوری میں یونانیوں سے بہت پیچھے تھے' بلکہ تحقیق و تنقید ان میں "کلیتاً" معدوم تھا' ان کو تاریخ اور دوسرے علوم میں بالکل دسترس نہ تھی۔ ان کے علوم کی وقعت طفلانہ خیالات سے زیادہ نہ تھی۔ تاریخ میں چند تخفیانہ قصوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا' اس لئے اگر نگاہ کو صرف انہی چیزوں تک محدود رکھا جائے تو ہندو قوم کی تمدنی ترقی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ان مثالوں کے علاوہ اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ دنیا میں بہت سی قومیں ایسی گزری ہیں جنھوں نے اگرچہ اعلیٰ درجہ کی تمدنی ترقی نہیں کی تھی' تاہم انھوں نے فنون لطیفہ میں اس قدر امتیاز حاصل کیا تھا کہ گزشتہ قوموں کو اس حیثیت سے ان کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی' چنانچہ اہل عرب نے جب یونانی اور رومن قوم کو پامال کردیا تو انھوں نے چند ہی دنوں میں بیزنٹائن عمارتوں کی صورت اس قدر بدل دی کہ اگر قدیم عمارتیں موجود نہ

ہوتیں تو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ عرب کے فن تعمیر کا اصلی مآخذ درحقیقت یہی عمارتیں تھیں۔

بعض قومیں ایسی بھی گزری ہیں' جن کو فنون لطیفہ اور فن ادب میں معمولی درجہ کی مہارت بھی نہ تھی' لیکن بااین ہمہ تمدنی حیثیت سے ان کا پایہ نہایت بلند تھا' چنانچہ فینیقی قوم اسی قسم کی متمدن قوم تھی' اس نے تمدن کی تمام شاخوں میں سے صرف تجارت کو ترقی دی تھی اور اس کے ذریعے سے دنیائے قدیم کے ایک سرے کو دوسرے سے باہم ملادیا تھا' لیکن خود اس نے کوئی چیز ایجاد نہیں کی تھی' اس کی تمام تاریخ تجارتی گرم بازاری کے کارناموں سے لبریز ہے۔ اس کے بالکل برعکس بعض قومیں ایسی بھی ہیں جن کے یہاں تمدن کے تمام عناصر نہایت پست حالت میں تھے' لیکن اس نے فنون لطیفہ میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کی تھی' اس کی بہترین مثال مغلوں کے کارنامہ ہائے زریں سے مل سکتی ہے' چنانچہ وہ ہندوستان میں جو عمارتیں اپنی یادگار میں چھوڑ گئے' انمیں ہندوستانی فن تعمیر کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا' بلکہ ان میں ایک ایسی تازگی اور جدت طرازی پائی جاتی ہے کہ ماہرین فن تعمیر نے ان کو صنائع انسانی کی بہترین مثال تسلیم کیا ہے' لیکن بایں ہمہ مغل قوم کو اعلیٰ درجہ کی متمدن قوموں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلہ میں ہم کو ایک عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ اعلیٰ درجہ کی متمدن قوموں میں عین تمدنی ترقی کے زمانے میں فنون لطیفہ نے اس قدر برگ و بار نہیں پیدا کئے تھے' بلکہ وہ زیادہ تر دور وحشت کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ مصریوں اور ہندوؤں نے جو عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی تھیں وہ ان کے دور قدیم کی یادگاریں تھیں۔ یورپ میں گاتھک طرز تعمیر قرون وسطیٰ میں ایجاد ہوا تھا۔ جبکہ تمام یورپین قومیں وحشیانہ حالت میں تھیں' حالانکہ اس طرز کے نمونے آج تک بے مثال خیال کئے جاتے ہیں' ان اسباب کی بنا پر کسی قوم کی تمدنی ترقی کا اندازہ صرف فنون لطیفہ کی ترقی سے نہیں کیا جاسکتا' کیونکہ اوپر گزر چکا ہے کہ وہ تمدن کا صرف ایک عنصر ہے' اور اس کی نسبت بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تمدن کا کوئی اعلیٰ ترین جزو ہے' بلکہ اکثر اعلیٰ درجہ کی متمدن قوموں کے تمدنی

عناصر میں وہ سب سے کم درجہ کا عنصر نظر آتا ہے' چنانچہ گزشتہ قوموں میں رومن اور موجودہ قوموں میں امریکن قوم کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ فنون لطیفہ اور علم ادب کے شباب کا زمانہ ہر قوم کے بچپن یا آغاز شباب کے زمانے میں آتا ہے' کسی قوم کی پختگی اور کامل نشوونما کی حالت میں ان چیزوں کو اس قدر ترقی نہیں ہوتی۔

اصل یہ ہے کہ بہت سے ایسے موانع و عوائق پیدا ہوجاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے دوسرے تمدنی عناصر کی ترقی کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی ترقی دائمی طور پر لازمی نہیں ہوتی' اس بناء پر وہ کسی تمدن کی ترقی کی دلیل نہیں قرار دیئے جاسکتے' ہم کو یہ علانیہ نظر آتا ہے' کہ جب فنون لطیفہ ترقی کے ایک خاص درجہ تک پہنچ جاتے ہیں' یعنی جب ان میں عجوبگی اور جدت طرازی پیدا ہوجاتی ہے تو دفعتاً" ان میں انحطاط شروع ہوجاتا ہے' اور یہ انحطاط تمدن کی دوسری شاخوں کی رفتار کا تابع نہیں ہوتا' یہ کلیہ کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' مصر' یونان' اور یورپ کی مختلف قوموں میں اس کا عالمگیر اثر نظر آتا ہے' اور جب تک کوئی سیاسی شورش نہ پیدا ہو' یا قوم کسی جدید مذہب کو قبول نہ کرلے' یا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ پیدا ہوجائے جس کے اثر سے فنون لطیفہ متاثر ہوجائیں' اس وقت تک یہ عمل انحطاط مستمر طور پر جاری رہتا ہے۔ چنانچہ قرون وسطی میں جب صلیبی لڑائیوں نے یورپ کو جدید علوم و فنون' اور جدید افکار و خیالات سے آشنا کیا' تو ان کی جدت طرازیاں فنون لطیفہ میں بھی نظر آئیں' اور رومانی طرز نے گاتھک قالب میں ظہور کیا' اس کے چند صدیوں کے بعد علم ادب کا وہ دور گزر گیا' جو یونانی اور رومن انشاپردازی کے مجموعی اثر کا نتیجہ تھا' اور اس کے ساتھ فنون لطیفہ نے گاتھک روش کو چھوڑ کر موجودہ روش اختیار کی' اسی طرح جب عرب ہندوستان میں آئے تو ان کے اثر سے ہندوستانی فنون لطیفہ میں بھی انقلاب پیدا ہوگیا۔

فنون لطیفہ چونکہ بعض خاص جذبات' اور بعض خاص تمدنی ضروریات کا نتیجہ ہوتے ہیں' اس لئے ان جذبات اور ضروریات کے ساتھ لازمی طور پر تجدد

اور تغیر ہوتا رہتا ہے، بلکہ کبھی کبھی ان جذبات اور ان ضروریات کے تغیر و زوال سے وہ "کلیتا" معدوم بھی ہوجاتے ہیں، لیکن اس سے نفسِ تمدن پر زوال نہیں آتا، بلکہ وہ اپنے اصلی آب و رنگ کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ کو تمدن کی دوسری شاخوں کے ساتھ کسی قسم کی وابستگی، مناسبت اور توازن نہیں ہے، تمدن نے اس زمانہ سے زیادہ کبھی ترقی نہیں کی تھی، لیکن بااین ہمہ اس زمانے سے زیادہ فنون لطیفہ کبھی عام اور مبتذل نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مذہبی خوش اعتقادیاں، وہ مذہبی ضرورتیں اور وہ مذہبی احساسات اب بالکل بدل گئے ہیں، جنھوں نے قدیم زمانے میں فنون لطیفہ کو تمدن کا دیباچہ زریں بنادیا تھا۔ اس زمانے میں فنون لطیفہ کی جلوہ طرازیاں صرف مذہبی عبادت گاہوں میں نظر آتی تھیں، لیکن اب فنون لطیفہ صرف زیب و زینت کا ذریعہ خیال کیے جاتے ہیں، جس میں بہت زیادہ وقت اور بہت زیادہ روپیہ صرف کرنا جائز نہیں، چونکہ اس فن کا اب تمدنی ضروریات میں شمار نہیں کیا جاتا، اس لئے وہ ایک مصنوعی فرض بلکہ زیادہ تر ایک تقلیدی چیزیں بن گیا ہے، اسی بنا پر آج فنون لطیفہ کو کسی قوم کا مخصوص قومی فن نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ ہر قوم دوسری قوم کے طرز عمل کی نقل اور تقلید کررہی ہے، اگرچہ اس نقل سے بھی نقل کرنے والوں کی ضرورتوں اور خواہشوں کا پتہ چل سکتا ہے، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ یہ نقل خیالات اور جذبات کسی قسم کی دلالت نہیں کرتی، قرون وسطی کی تصویریں باوجود اپنی سادگی کے ہم کو بتاتی ہیں کہ اس زمانے کے خوش اعتقاد مصور، حوارئین مسیح، جنت اور دوزخ کی جو تصویریں کھینچتے تھے، ان کا اس زمانے میں خاص اثر تھا، اور وہ اس وقت حاصل زندگی خیال کی جاتی تھیں، لیکن اس زمانے کے غیرمذہبی مصور عمارتوں کی دیواروں پر نوع انسانی کے عہد طفولیت کی جو قدیم تصویریں صرف اس غرض سے بناتے ہیں کہ "عہد گزشتہ کی یاد تازہ ہوجائے" ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ محض نقالی ہے۔

فنون لطیفہ کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کی مخصوص کیفیت کو پیش نظر

کردے اور ہم کو خود تصویروں کے اندر مصور کے اصلی محسوسات اور حقیقی مشاہدات کی تصویر نظر آجائے' لیکن اگر صرف ایسی تصویریں بنائی جائیں جو ان عقائد و خیالات کی ترجمانی کریں' جن کا ہم خود اعتقاد نہیں رکھتے' تو یہ حقیقی فن نہیں بلکہ نقالی اور تقلید ہے۔ ہمارے زمانے میں من حیث الفن صرف ان چیزوں کی تصویروں کو اصلی تصویر کہہ سکتے ہیں جو ہمارے گرد و پیش موجود ہیں' ہمارے زمانہ کا اصلی فن تعمیر وہ ہے جو ہمارے سامنے پنج منزلہ عمارتوں' پانی کی نہروں' بڑے بڑے پلوں' اور ریلوے لائنوں کا ڈھانچہ کھڑا کردیتا ہے۔ فن تعمیر کا مقصد انسان کو فائدہ پہنچانا ہے' اس لئے فن تعمیر کے یہی نمونے ہمارے خیالات' اور جذبات کے مواقف ہیں۔ جس طرح گاتھک طرز کے گرجے اور عہد(۲) امراء کے محل' ایک مخصوص دور کو ہمارے پیش نظر کردیتے ہیں' اسی طرح اس زمانے کا فن تعمیر موجودہ دور کی صحیح تصویر کھینچ دیتا ہے' لیکن دور جدید کے مکانات اور عہد قدیم کے گرجے دونوں زمانہ آئندہ کے انجینئر کو یکساں نظر آئیں گے' کیونکہ ان کی وقعت اس کے نزدیک ان پتھر کی کتابوں کے دو صفحوں سے زیادہ نہ ہوگی' جن کو ہر زمانہ' آنے والے زمانہ کے لئے چھوڑ جاتا ہے' ہر طرز اور ہر روش اپنے زمانہ کے خیالات کا آئینہ دار ہوتی ہے' اور چونکہ زمانہ اور زمانہ کے ساتھ تمام قومیں بدلتی رہتی ہیں' اس لیے ان خیالات میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے' لیکن یہ تمام خیالات فلسفیانہ حیثیت سے ایک ہی درجہ رکھتے ہیں' کیونکہ ان کی وقعت اس سے زیادہ نہیں کہ "وہ وقتی علامتیں ہیں" اس لحاظ سے تمام قومی مظاہر کی طرح فنون لطیفہ بھی ایک قومی مظہر ہے' اور اس حیثیت سے اس میں اور تمدن کی دوسری شاخوں میں کوئی فرق نہیں ہے' لیکن بااین ہمہ وہ ٹھیک ٹھیک تمام قوموں کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتا۔

ہمارے موضوع کے لحاظ سے یہ بحث درحقیقت نہایت ضروری بحث ہے کیونکہ ہر تمدنی شاخ کی اہمیت کا صحیح معیار صرف اس وقت قائم کیا جاسکتا ہے' جو اس کلیہ کو پیش نظر رکھا جائے کہ "جب کوئی قوم اس کو دوسری قوم سے منتقل کرکے اپنے یہاں لاتی ہیں تو اس میں تغیر و تبدل پیدا کرنے کی کس قدر صلاحیت

رکھتی ہے؟" اگر اس قوم کو فنون لطیفہ میں کامل دسترس ہوتی ہے تو وہ جنس مستعار کو اپنے خاص سانچے میں ڈھال لیتی ہیں لیکن تمدن کی جو شاخیں خاص اس قوم کے اصلی جذبات کو نمایاں نہیں کرتیں' اوپر اس کا بہت کم اثر پڑتا ہے' چنانچہ جب رومن قوم نے یونانی طرز عمارت کی تقلید کی تو اس میں کوئی نمایاں تغیر نہیں پیدا کیا' کیونکہ رومن قوم کی روح کا مظہر فنون لطیفہ نہ تھے' بلکہ اس کا میلان تمدن کی دوسری شاخوں کی طرف تھا' لیکن باایں ہمہ چند دنوں کے بعد آب و ہوا اور جغرافیانہ خصوصیات کے اثر سے فنون لطیفہ بھی متاثر ہوتے ہیں اور اضطرار قومی روح پر دلالت کرتے ہیں' یہاں تک کہ رومن قوم جیسی تہی دست قوم بھی ان پر اپنا ملکی اثر ڈال سکتی ہے' چنانچہ روما کی وہ قدیم عبادت گاہیں' وہ قدیم محل' وہ قدیم محرابیں' اور وہ قدیم نقش و نگار بھی جو اگرچہ یونانیوں یا یونانیوں کے شاگردوں کی صناعیوں کی عکسی تصویریں ہیں' تاہم ان کا آب و رنگ' انکا سازوسامان' ان کا طول و عرض' اور ان کی تعمیر کا مقصد ایتھنز کے نازک و لطیف خیالات کی ترجمانی کرتا' بلکہ اس جنگی قوت' اور فوجی شان و شوکت کا اظہار کرتا ہے' جس نے روما میں ہلچل ڈال دی تھی' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم جس چیز کو اپنے استعمال میں لاتی ہے گو وہ اصل میں اس کی قومی شخصیت سے خارج ہو' تاہم وہ اس پر اپنا ذاتی اثر ڈال ہی لیتی ہے' اور وہ ہم کو اس کے مزاج عقلی' اور خیالات نفسانی کا پتہ دیتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ معمار' ادیب' شاعر' غرض ہر وہ شخص جو صناع ہوتا ہے' اپنے اندر ایک ساحرانہ طاقت رکھتا ہے' جس کے ذریعہ سے اپنی صناعیوں کو اپنی قوم اور اپنے زمانے کی روح کا حقیقی مظہر بنادیتا ہے' یہی وجہ ہے کہ ہر صناع فطرتاً" شدید الانفعال ہوتا ہے' اس کے احساسات الہامی اور فطری ہوتے ہیں' وہ صرف ظاہری صورتوں کا ادراک کرتا ہے اور ان کی لم و حقیقت سے بحث نہیں کرتا' اور اس بنا پر وہ اس جماعت کے خیالات کا آئینہ ہوتا ہے جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے' اس کی صناعیوں کے ذریعہ سے اس کے قومی تمدن کے متعلق نہایت سچی شہادت حاصل کی جاسکتی ہے' وہ جو کچھ دیکھتا ہے طوطے کی طرح اس

کی نقل کردیتا ہے' اس لئے وہ جو کچھ زبان حال سے کہتا ہے' اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا۔ اس پر گردوپیش کے محسوسات کا شدت کے ساتھ اثر پڑتا ہے' اس لئے وہ تمدنی احساسات' تمدنی خیالات' تمدنی ضروریات' اور تمدنی میلان کی تعبیر میں جادہ اعتدال سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹتا' آزادی خیال سے وہ بالکل ناآشنا ہوتا ہے' وہ اپنے عقیدہ کو تقلید اور ان موروثی عقائد خیالات' اور جذبات کے تنگ دائرہ میں محدود کردیتا ہے' جن سے قومی روح پیدا ہوتی ہے' اور اس لئے ان تمام چیزوں کا اس پر شدت کے ساتھ اثر پڑتا ہے' کیونکہ وہ شاعرانہ افعال جہاں اس کی صناعیوں کا خمیر اور قوام تیار ہوتا ہے' انہی جذبات و احساسات کے چشم و ابرو کا اشارہ ہوتے ہیں' آج اگر ہم ان تمام صنعتی یادگاروں کو کھودیں اور زمانہ گزشتہ کے واقعات کے معلوم کرنے کا ذریعہ صرف ان اختراعی قصص و حکایات میں محدود ہوجائے جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں' تو دور ماضی ہماری نگاہوں سے بالکل اوجھل ہوجائے گا۔

غرض فنون لطیفہ کا اصلی جوہر یہ ہے کہ جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اس کی ضروریات کی ٹھیک ٹھیک تعبیر کریں' اگرچہ فنون لطیفہ کی ہر شاخ نہایت فصاحت کے ساتھ ان ضروریات کی ترجمانی کرتی ہے' لیکن ان میں عمارتوں کو خاص طور پر خصوصیت حاصل ہے۔ وہ کتابوں سے زیادہ حق گو ہیں' اور مذہب و زبان کی بہ نسبت اس میں بہت کم تصنع پایا جاتا ہے' کیونکہ احساس اور ضرورت دونوں نے ان کو پیدا کیا ہے' معمار انسان اور خدا دونوں کا گھر بناتا ہے' اور عبادت گاہوں اور خاندانوں ہی کے اندر ان اسباب کا خمیر تیار ہوا ہے جنھوں نے تاریخ انسانی کو پیدا کیا ہے۔

ان تمام بیانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام تمدنی عناصر اس قوم کی روح کا مظہر ہیں جس نے ان کو پیدا کیا ہے' اور ان میں بعض اجزاء جو مختلف قوموں اور مختلف زمانوں یا ایک ہی قوم کے تغیرات سے بدلتے رہتے ہیں' وہ اس روح پر بہ نسبت دوسرے اجزاء کے نہایت صحت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں۔

چونکہ یہ تمام تمدنی عناصر مختلف قوموں' اور مختلف زمانوں کے لحاظ سے

بدلتے رہتے ہیں' اس لئے نہ ان میں کسی کو تمام قوموں کے تمدن کا عام معیار قرار دیا جاسکتا' نہ ان میں کوئی ترتیب قائم کی جاسکتی' کیونکہ زمانہ کے تغیرات سے ان کی اہمیت بدل جاتی ہے' اور ان کے ساتھ اس ترتیب میں بھی تغیر پیدا ہوجاتا ہے' اگر صرف مادی فوائد کے لحاظ سے تمدنی عناصر پر بحث کی جائے تو تمدن کا سب سے اہم عنصر نظام فوج کو قرار دیا جاسکتا ہے' جس کے ذریعہ سے انسان دوسروں کو اپنا غلام بناتا ہے' اور اس حیثیت سے یونان کے ادباء' فلاسفہ' اور ماہرین فنون لطیفہ کو روما کے اوباشوں کے مقابل میں مصر کے حکماء کو نیم وحشی' ایران کی صف میں ہندوؤں کو غیر متمدن مغلوں کے پہلو میں پست درجہ ماننا پڑے گا' لیکن تاریخ اس دقیق تقسیم کو ہاتھ نہیں لگاتی' اس کے نزدیک سب سے بڑی چیز جنگی فوقیت و امتیاز ہے مگر فوجی تفوق کے ساتھ دوسرے تمدنی عناصر بہت کم ترقی کرتے ہیں' فوجی تفوق دوسرے تمدنی عناصر کے ساتھ بہت کم جمع ہوسکتا ہے کیونکہ فوجی غلبہ میں اس وقت انحطاط پیدا ہوجاتا ہے جو خود کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے' چنانچہ تمام متمدن سلطنتیں تمدن کے معراج کمال پر پہنچ کر فنا ہوگئیں اور اپنی جگہ ان وحشی قوموں کے لئے خالی کردی' جو اگرچہ عقل میں ان سے بدرجہا پست رتبہ تھیں' لیکن ان میں اخلاقی اور فوجی طاقت پائی جاتی تھی' اور یہ دونوں اخلاقی جوہر ہمیشہ تمدنی سامان عیش کے ڈھیر میں گم ہوجاتے ہیں اور اس بنا پر ہم کو افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تمدن کے جو عناصر (مثلاً" نظام فوج) حکماء کی نگاہ میں نہایت کم درجہ رکھتے ہیں' اجتماعی حیثیت سے انکی قدر و قیمت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر گزشتہ زمانہ کا قانون طبعی آنے والے زمانہ پر بھی منطبق ہوسکتا ہے تو اعلی درجہ کی تمدنی ترقیاں قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہیں' جب کسی قوم کا شیرازہ اخلاق درہم برہم ہوجاتا ہے' تو وہ مرجاتی ہے' اور اخلاقی اوصاف میں اسی قدر متزلزل پیدا ہوتا ہے' جس قدر قوم عقل اور تمدن میں ترقی کرتی ہے۔

حواشی

(۱) اس موقع پر مصنف نے ان نمونے کے چند نام بھی بتائے ہیں' جن کو نامانوس

ہونے کی وجہ سے ہم نے چھوڑ دیا ہے۔

(۲) نائٹ

دوسری فصل

مذاہب' سیاسیات' اور زبان میں کیونکر تغیرات پیدا ہوتے ہیں؟

کوئی قوم متمدن ہو یا غیر متمدن اپنے تمدنی عناصر میں دفعتاً" تغیر نہیں پیدا کر سکتی' جن قوموں نے اپنا مذہب' اپنی زبان' اور اپنے فنون لطیفہ کو بدل دیا ہے' ان کی حالت سے اس کا مقابلہ' جاپان کی مثال' یہ تغیر ظاہری ہے' بودھ' اسلام' عیسائیت' اور براہمہ کے مذہب میں ان قوموں کے لحاظ سے کلی تغیرات جنھوں نے ان مذاہب کو قبول کیا ہے' سیاست اور زبان جب کسی قوم میں منتقل ہوتی ہے' تو اس قوم کی وجہ سے ان میں تغیرات' مختلف زبانوں کے مترادف الفاظ مختلف معانی و احساسات پر دلالت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے کسی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا' بعض قوموں کا تمدن جو تاریخی کتابوں میں بہت زیادہ تغیر پذیر نظر آتا ہے' اس کا سبب' تمدن و مذہب کا باہم جو اثر پڑتا ہے' اس کے حدود کیا ہیں؟

ہم کسی دوسری جگہ بیان کر آئے ہیں کہ متمدن قومیں غیر متمدن قوموں کو اپنے تمدنی حلقہ اثر میں نہیں لا سکتیں' اور یورپ نے اس تمدنی انقلاب میں تعلیم' تربیت' اور نظام سیاست وغیرہ کے ذریعہ سے جو فائدہ اٹھانا چاہا ہے وہ بالکل ناکافی ہے' اس سلسلہ میں ہم نے اس مسئلہ کو نہایت واضح کر دیا ہے کہ تمام تمدنی شاخوں کا مبدء اصلی قوم کا وہ مزاج عقلی ہوتا ہے جو مدتوں کے موروثی اثر سے

پیدا ہوجاتا ہے اور جب تک یہ مزاج نہ بدل جائے' تمدنی شاخوں میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کیا جاسکتا' لیکن مزاج عقلی کو صرف زمانہ ہی بدل سکتا ہے' خود فاتح قومیں اس میں کوئی تغیر نہیں پیدا کرسکتیں۔ ہر پست درجہ قوم کو تمدنی مدارج کے طے کرنے میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' چنانچہ جن وحشی قوموں نے یونانی تمدن کو پامال کردیا ان کے حالات سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر جو لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ان مراحل کو پھاند جانا چاہتے ہیں' وہ اس قوم کے اخلاق کو پراگندہ اور اس کے دماغ کو پریشان کرتے ہیں' اور اس کو ایک ایسی سطح کی طرف لے جانا چاہتے ہیں' جو پہلے سے بھی زیادہ پست ہے۔

ہم نے اس مسئلہ میں غیر متمدن قوموں کے متعلق جو دلیل پیش کی ہے' وہ متمدن قوموں پر بھی صادق آتی ہے' اس لئے اگر وہ صحیح ہے تو یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ متمدن قومیں اپنے تمدن میں دفعتاً" کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرسکتیں بلکہ ان کو اس تمدنی انقلاب میں بتدریج مختلف مرحلوں اور مختلف دوروں سے ہوکر گزرنا پڑے گا' بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متمدن قوموں نے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا ہے' ایک نظام سیاست کو دوسرے سیاسی نظام کے قالب میں بدل دیا ہے ایک زبان کا دوسری زبان کے بجائے انتخاب کیا ہے' قدیم آبائی فنون لطیفہ کو چھوڑ کر جدید فنون لطیفہ کی پیکر آرائی کی ہے' لیکن حقیقت میں یہ انقلاب اس وقت ہوا ہے جبکہ قوم ان تمام چیزوں کو ایک مدت میں جلا دے کر اپنے مزاج عقلی کے موافق بنالیا ہے۔

بظاہر تاریخ کا ہر صفحہ اس نظریہ کی مخالفت پر آمادہ نظر آتا ہے' ہم علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ بہت سی قوموں نے اپنے تمدنی عناصر بدل دیئے ہیں' اور اپنے قدیم مذہب' قدیم سیاست' اور قدیم زبان کے بجائے' جدید مذہب' جدید سیاست' اور جدید زبان کو اختیار کرلیا ہے' بعض قومیں اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو چھوڑ کر عیسائی مذہب' بدھ مذہب' یا مذہب اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئی ہیں' بعض قوموں نے اپنی زبان بالکل بدل دی ہے' اور بعض قوموں نے اپنے نظام سیاست اور فنون لطیفہ کو بالکل دوسرے قالب میں ڈھال لیا ہے' بظاہر

اس قسم کے تمدنی انقلاب کے لئے ایک فاتح' ایک مشنری یا بعض قومی ہوس پرستیوں کا وجود کافی ہے' لیکن درحقیقت تاریخ نے ان انقلابات کی روایت میں اپنی قدیم فطری غلطی کی تائید کی ہے' ورنہ اگر ہم ان انقلابات و تغیرات کو دقیق نگاہ سے دیکھیں' تو ہم کو نظر آئے گا کہ صرف ان تمام چیزوں کے نام بدل گئے ہیں' حقیقت نہیں بدلی ہے' الفاظ کے تہ میں جو معنے تھے' وہ اب تک زندہ ہیں اور ان میں بہت دنوں کے بعد تغیر پیدا ہوگا۔

اس مسئلہ کی تشریح کے لئے ہم کو مختلف قوموں کے تمدنی عناصر کو ایک جگہ جمع کرنا پڑے گا یعنی ان کی ایک جدید تاریخ مرتب کرنا ہوگی' لیکن ہم نے اپنی مختلف کتابوں میں اس فرض کو ادا کردیا ہے' اور یہ اس کے اعادہ کا موقع نہیں' اس جگہ تمام تمدنی عناصر کے بجائے صرف ایک عنصر یعنی فنون لطیفہ کا ذکر کرنا کافی ہوگا' لیکن فنون لطیفہ کے تغیرات کا ذکر ایک مستقل فصل میں آگے آئے گا اس سے پہلے ان تغیرات کا ذکر مناسب ہوگا جو تمدن کے دوسرے عناصر پر طاری ہوتے ہیں تاکہ یہ ثابت ہوجائے کہ جو نظریہ تمدن کے ایک عنصر پر صادق آتا ہے' وہ اس کے دوسرے عناصر پر بھی صادق آسکتا ہے' اور جس طرح ہر قوم کے فنون لطیفہ اس کے مزاج عقلی کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں' اسی طرح یہ مناسبت زبان' نظام سیاست' اور مذہبی عقائد میں بھی پائی جاتی ہے' اور اس لحاظ سے نہ ان میں دفعتاً" کوئی تغیر پیدا ہوسکتا ہے' نہ ان کو کسی دوسری قوم میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ مذہبی انقلابات کی تاریخ اس نظریہ کے بالکل مخالف ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہبی تاریخ ہی میں اس نظریہ کی صحت کی یقینی مثالیں ملتی ہیں' اور اس میں اس قسم کے دلائل پائے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ' جس طرح انسان اپنے قدوقامت خط و خال' اور رنگ روپ کے بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا' اسی طرح کوئی قوم اپنے تمدنی عناصر میں تغیر نہیں پیدا کرسکتی۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ تمام بڑے بڑے مذاہب مثلاً" بودھ،

مذہب' ہندومت' عیسائیت اور اسلام کے حلقہ اثر میں دفعتاً" بڑی بڑی قومیں داخل ہوگئیں ہیں' اور ان مذاہب نے ان کے اصول مذہب کو دفعتاً" بدل دیا ہے' لیکن غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے قدیم مذہب کی حقیقت کو نہیں بدلا ہے' بلکہ صرف اس کے نام کو بدل دیا ہے' اور ان مذاہب جدیدہ نے ان کے قدیم مذہب میں کوئی تغیر نہیں پیدا کیا ہے' بلکہ وہ خود ان کے قدیم عقائد کے قالب میں ڈھل گئے ہیں' اس بنا پر اس جدید مذہب کی حقیقت اس قدیم مذہب کے پھیلاؤ اور وسعت سے زیادہ نہیں' بلکہ ان مذاہب میں جو ایک قوم سے منتقل ہوکر دوسری قوم میں آتے ہیں' اس قدر تغیر پیدا ہوجاتا ہے کہ صرف ان کا نام ہی نام باقی رہ جاتا ہے' بودھ مذہب اس کی ایک نمایاں مثال ہے' چنانچہ جب وہ چین میں داخل ہوا تو اس کی تمام خصوصیات اس طرح مٹ گئیں کہ اول اول علماء نے اس کو ایک مستقل مذہب خیال کیا اور ان کو ایک مدت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بودھ مذہب ہے' جس میں چینیوں نے اس قدر تغیرات پیدا کردیئے ہیں' یہ مذہب ہندوستان' چین' نیپال' اور سیلون میں بھی قائم ہے' لیکن اس کی حقیقت ہر جگہ ایک دوسرے سے مختلف ہے' وہ ہندوستان میں قدیم برہمنی یا قدیم مذہب کی ایک شاخ ہے' اور ان دونوں میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے' لیکن چین میں وہ اس مذہب سے گہرا تعلق رکھتا ہے' جو اس کے پہلے وہاں عام طور پر موجود تھا' خود قدیم ہندو مذہب کی بھی یہی حالت ہے' ہندوستان مختلف ذاتوں کا مرکز ہے' اور اگرچہ ان سب کا مذہب ایک ہے' تاہم ان مختلف گروہوں کے عقائد میں ناگزیر طور پر اختلاف پایا جاتا ہے' ان میں جو لوگ قدیم برہمنی مذہب کے پابند ہیں' ان سب کا اعتقاد یہ ہے کہ ان کے سب سے بڑے معبود وشنو' اور شیو ہیں اور ان کی مذہبی کتاب وید ہے' لیکن درحقیقت ان دونوں معبودوں کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے' اور وید کی حقیقت چند الفاظ بے معنی سے زیادہ نہیں ہے۔ ان تمام لوگوں کے مقابل میں اور بے شمار مذاہب' اور مختلف ذاتوں اور مختلف فرقوں کی طرح مختلف عقائد پیدا ہوگئے' ہندوستان میں مذہبی حیثیت سے توحید بھی پائی جاتی ہے' بہت سے معبود بھی پوجے

جاتے ہیں، حیوانات، جمادات، آباؤاجداد، بھوت پریت، غرض تمام دنیا کی پرستش بھی کی جاتی ہے، لیکن اگر ہم وید میں ہندوستان کے حقیقی مذہب کی تحقیقات کرنا چاہیں تو ہم کو ان تمام معبودوں میں سے جو یہاں پوجے جاتے ہیں، اور ان تمام عقائد میں سے جو یہاں کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں صرف معدودے چند کا پتہ چلے گا، اس لحاظ سے اگرچہ برہمنی مت اس کتاب مقدس کی عزت کرتا ہے، لیکن اس کتاب نے جس مذہب کی تلقین کی ہے، اس کا کوئی جزو محفوظ نہیں ہے، اسلام بھی باوجود اپنے عقیدہ توحید کی سادگی کے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، چنانچہ ایران، عرب، اور ہندوستان کے اسلام میں عظیم الشان فرق ہے، ہندوستان میں چونکہ تعدد خدا یعنی شرک کا عقیدہ نہایت پختہ طور پر قائم ہوگیا تھا، اس لئے ہندوستانیوں نے سخت سے سخت مواحدنہ مذہب میں بھی نہایت آسانی کے ساتھ بہت سے خدا پیدا کرلئے، پانچ کروڑ ہندوستانیوں کا اعتقاد ہے کہ محمد ﷺ اور دوسرے اولیاء خدا ہیں (ا) اور انھوں نے اپنے ہزاروں معبودوں کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کرلیا ہے عملی حیثیت سے اسلام ہندوستان کے مسلمانوں میں مساوات بھی پیدا نہ کرسکا، حالانکہ مساوات ہی اس کی اشاعت کا ایک قوی ترین ذریعہ تھی، ہندوؤں کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی مختلف ذاتیں موجود ہیں، دکن اور دراگن قبائل میں اسلام کی صورت اس قدر مسخ ہوگئی ہے کہ اس میں اور ہندوپن میں صرف اس قدر فرق ہے کہ مسلمان محمد ﷺ کا نام لیتے ہیں، جمعہ جماعت قائم کرتے ہیں، لیکن انھوں نے اپنے پیغمبر کو بھی خدا کی حیثیت دے دی ہے، اور اس کی اسی طرح عظمت بھی کرتے ہیں۔

اسلام کے ان تغیرات کے مشاہدہ کے لئے ہم کو ہندوستان کے سفر کی ضرورت نہیں، مسلمانان الجزائر (الجیریا) کی حالت کا مطالعہ کرلینا کافی ہے، الجزائر میں دو مختلف قبیلے ہیں، یعنی عرب، اور بربر اور دونوں کے دونوں مسلمان ہیں لیکن دونوں کے اسلام میں بڑا فرق ہے، بربر لوگ تعداد ازدواج کے قائل نہیں، ان کا ایمان صرف ایک بی بی پر ہے ان کے اسلام میں اس بت پرستی کی بھی آمیزش پائی جاتی ہے، جس کے وہ کارتھج دور حکومت سے خوگر ہوگئے

تھے۔

یورپ میں بھی عیسائی مذہب اختلاف اقوام کی بنا پر ان تغیرات سے محفوظ نہیں بہت سے لوگ ہیں' جو مذہبی کتابوں کے اصول و قواعد کو بلفظہا محفوظ رکھنا چاہتے ہیں' لیکن پھر بھی وہ الفاظ ہیں' اور ان الفاظ کی تشریح و تفسیر میں ہر قوم نے مختلف مذاہب اختیار کئے ہیں'عیسائیوں میں بعض قومیں خالص بت پرست ہیں' چنانچہ نشیبی برطانیہ کے باشندے بتوں کی پرستش کرتے ہیں' اسپین کے عیسائی مخلوقات کو خدا قرار دیتے ہیں' اٹلی کے دہقانی عیسائی مریم عذراء کے مجسمہ کو خدا مانتے ہیں' اگر ہم زیادہ غور و فکر سے کام لیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ پروٹسٹنٹ مذہب بھی دو مختلف قوموں یعنی یورپ کی شمالی و جنوبی اقوام کے اسی تفسیری اختلاف کا نتیجہ ہے' اول الذکر نے اپنے عقائد خود اجتہادی طور پر قائم کئے' اور معاملات زندگی کو خود اپنے فہم اور فیصلہ کے مطابق طے کرلیا' لیکن جنوبی قوم اپنے قدیم جمود و تقشف اور عقلی و اجتہادی پستی پر قائم رہ گئی۔

ان مشاہدات کی تشریح و توضیح میں طوالت پیدا ہوتی جاتی ہے' اس بنا پر ہم صرف تمدن کے دو عنصر یعنی نظام سیاست اور زبان کا ذکر اور کرنا چاہتے ہیں۔

یہ نظریہ مذہب اور سیاست دونوں پر یکساں صادق آتا ہے یعنی مذہب کی طرح سیاست بھی جب ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہوتی ہے تو اس کی صورت بالکل بدل جاتی ہے' زیادہ طول بیانی کی ضرورت نہیں' ہر شخص خود اپنے زمانہ میں دیکھ سکتا ہے کہ قوموں کے اختلاف کی بنا پر ایک ہی سیاسی نظام میں کس قدر تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے' چنانچہ جب ہم ممالک متحدہ امریکہ پر بحث کریں گے تو ایک مستقل فصل میں اس کی تشریح کردیں گے۔

ہر سیاسی نظام درحقیقت ضرورت کا نتیجہ ہوتا ہے' اور صرف ایک نسل کا ارادہ اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا' بلکہ قومی انقلاب کے ہر دور میں خاص احساسات' خاص خیالات' خاص موروثی آثار پیدا ہوجاتے ہیں اور ان تمام حالات میں ایک مخصوص نظام سیاست کی ضرورت ہوتی ہے' جو دوسری حالتوں کے لئے موزوں نہیں ہوتا' نظام سیاست میں حکومت کو کوئی دخل نہیں ہے' اور

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جس نے محض اپنی خواہش کے موافق اپنے نظام سیاست کو قائم کیا ہو اور اگر شاذونادر کسی قوم نے ایسا کیا بھی تو وہ اس کو قائم نہیں رکھ سکی۔ ہمارے یہاں ایک مدت سے جو سیاسی انقلابات پیدا ہوتے رہتے ہیں، انھوں نے مدبرین سیاست کو اس حقیقت کا یقین دلادیا ہوگا، بلکہ میرا گمان تو یہ ہے کہ بجز کم فہم، عامی اور متعصب لوگوں کے کسی کا یہ خیال نہیں ہے کہ عظیم الشان اجتماعی تغیرات، صرف فرمان شاہی کے ذریعہ سے پیدا کئے جاسکتے ہیں، ہر نظام سیاست صرف اس لئے مفید خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ان تغیرات کو مستحکم کردیتا ہے، جو اخلاق اور خیالات میں پیدا ہوجاتے ہیں، اس لحاظ سے وہ اخلاق و افکار کا تابع ہے ان پر مقدم نہیں ہے، درحقیقت کوئی سیاسی یا اجتماعی نظام انسان کے اخلاق و افکار میں نہ تغیر پیدا کرتا نہ کسی قوم کو کافر یا پابند مذہب بناتا نہ لوگوں کو آزادی و استقلال کی تعلیم دیتا، نہ ان کے گلے میں طوق و زنجیر ڈال کر ان کو حکومت کا غلام بناتا۔

نظام سیاست کی طرح ایک زبان بھی جب کسی قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہوتی ہے تو اس میں تغیر و تبدل ہوجاتا ہے، اس بنا پر تمام دنیا کے لئے ایک مشترکہ زبان کے ایجاد کرنے کا خیال ایک طفلانہ ہوس پرستی ہے، یہ سچ ہے کہ گال قوم نے رومن فتوحات کی دو صدی بعد لاطینی زبان کو اختیار کرلیا تھا، لیکن انھوں نے اپنی ضروریات کے مطابق بہت جلد اس میں تغیرات بھی پیدا کرلئے، اور اس کو اپنے خیالات کے رنگ میں رنگ لیا، چنانچہ اسی کا نام آج فرنچ زبان ہے، مختلف قومیں بہت دنوں تک ایک ہی زبان کا استعمال نہیں کرسکتیں بلکہ تجارتی ضروریات اور ملکی فتوحات کے اثر سے ان کو اپنی اصل زبان کے علاوہ دوسری زبان سے بھی کام لینا پڑتا ہے، اس طرح چند نسلوں کے بعد اس جدید زبان میں عظیم الشان تغیر پیدا ہوجاتا ہے، اور جس قدر پشتوں کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے، اسی قدر یہ تغیرات بڑھتے جاتے ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ مختلف قوموں کی مختلف زبانیں ہوتی ہیں، چنانچہ ہندوستان اس کی سب سے زیادہ بدیہی مثال ہے، یہاں مختلف قومیں

آباد ہیں' اور اس بنا پر اگر علماء نے یہاں کی زبانوں کی تعداد دوسو چالیس بتائی ہے' تو یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں' یونانی اور فرنچ زبان میں جس قدر فرق ہے' ہندوستان کی بعض زبانوں میں اس سے بہت زیادہ باہمی فرق موجود ہے۔ ہندوستان میں تین سو بولیاں بھی ہیں' لیکن ان میں سب سے زیادہ مہتم بالشان وہ زبان ہے' جو ان سب میں سب سے زیادہ نئی ہے' یعنی اردو جس کی عمر تین سو برس سے زیادہ نہیں۔ یہ زبان فارسی اور عربی سے جو فاتحین ہندوستان کی زبان تھی' اور ہندی سے جو اس ملک کی زبانوں میں سب سے زیادہ عام اور متداول تھی مرکب ہے' لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد فاتح اور مفتوح دونوں نے اپنی اصلی زبان بھلادی' اور ان دونوں فرقوں کے اختلاط سے جو جدید نسل پیدا ہوئی اس نے اپنی ضرورت کے مطابق اردو کو اپنی عام زبان بنالیا۔

زبان کے متعلق سب سے بڑا اساسی مسئلہ یہ ہے کہ قوموں کے اختلاف سے الفاظ کے معانی میں بھی اس قدر اختلاف پیدا ہوجاتا ہے کہ دو ہم معنی الفاظ میں بھی اس قدر فرق محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ مرادف الفاظ نہ تھے اور اس لئے ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا خود ایک ہی قوم کی زبان میں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں' مثلاً" ایک زمانے میں ایک لفظ کسی خاص معنی میں مستعمل ہوتا ہے پھر چند سال کے بعد اس کے معنی بدل جاتے ہیں' پرانے لوگوں کے دلوں میں صرف اسی قدیم معنی کا تصور پیدا ہوتا تھا' بعد کو اخلاق و عادات' اور خیالات کے تغیرات سے الفاظ کے معانی میں بھی تغیرات پیدا ہوگئے' لیکن ان قدیم الفاظ کا بدلنا چونکہ ناممکن تھا' اس لئے بول چال میں انہی کا استعمال ہوتا رہا۔ تاہم ان قدیم و جدید معانی میں ایک خاص قسم کی مناسبت ضرور قائم رہتی ہے۔ اگر ہم کو قدیم قوموں کے تاریخی مطالعہ سے یہ نظر آئے کہ ہمارے اور ان کے تمدن میں کوئی مناسبت نہیں ہے' تو ہم کو صاف طور پر معلوم ہوجائے گا' کہ اگر ہماری زبان میں ان کی زبان کا ترجمہ کیا جائے' تو اس کا صرف یہ نتیجہ نکلے گا کہ ہماری زبان میں چند الفاظ کا اضافہ ہوجائے گا' جن کا قالب قدیم معانی سے خالی ہوگا' یعنی ان الفاظ کے ذریعہ سے جو تصور ان قدیم

قوموں کے دلوں میں پیدا ہوتا تھا وہی ہمارے دلوں میں بالکل اس کے مخالف خیال پیدا کریں گے' ہندوستان میں یہ نظریہ سب سے زیادہ واضح ہوجاتا ہے' سیاسی انقلابات سے چونکہ ہندوستانی خیالات میں ہمیشہ انقلاب ہوتا رہا' اس لئے یورپ کی طرح وہاں کے الفاظ و معانی میں بھی استحکام و ثبات نہیں پیدا ہوا' اس کے علاوہ یورپین اور ہندوستانی خیالات میں کسی قوم کا تعلق بھی نہیں ہے' اس بنا پر بہت سی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ یورپین زبانوں میں نہیں ہوسکتا' مثلاً" وید کے ترجمہ کے لئے یورپ میں جو کوششیں ہوئیں سب کی سب ناکامیاب ثابت ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو قومیں عمر میں' قومیت میں' تربیت میں ہم سے مختلف ہیں' ان کے خیالات کی تہہ تک پہنچنا نہایت مشکل' اور قدیم قوموں کے خیالات کا دریافت کرنا تو اس سے بھی زیادہ مشکل ہے' ہم کتنے ہی علمی ترقی کرجائیں' یہ مرحلہ طے نہیں ہوسکتا' بلکہ جس قدر علم کو ترقی ہوگی اسی قدر ہم پر واضح ہوتا جائے گا کہ اس سفر سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

ان چند مثالوں سے ان تغیرات کی حقیقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جن کو قومیں ان تمدنی عناصر میں کرلیتی ہیں' جو دوسری قوموں سے اخذ کئے جاتے ہیں' بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تغیرات نہایت وسیع پیمانے پر پیدا ہوتے ہیں' کیونکہ ان تمدنی عناصر کے نام فوراً" بدل جاتے ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت کم کم رونما ہوتے ہیں' لیکن جب بہت سی نسلیں گزر جاتی ہیں' اور وراثت کا اثر پے درپے پڑتا رہتا ہے تو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو تمدنی عنصر کسی غیر قوم سے لیاگیا تھا وہ اس عنصر سے مخالف تھا' جس کا وہ قائم مقام ہوا ہے لیکن تاریخ کے ذریعہ سے ان تغیرات کا پتہ نہیں چل سکتا' کیونکہ تاریخ میں صرف ظاہری چیزوں سے بحث کی جاتی ہے مثلاً" جب ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں کہ فلاں قوم نے اپنے اصلی مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ درحقیقت اس نے اس اصلی مذہب کو قبول کرلیا ہے' اور ان خود ساختہ عقائد کو نظرانداز کردیتے ہیں' جن کو اس قوم نے اس مذہب میں شامل

کردیا ہے' اس بنا پر جو لوگ حقیقت کو الفاظ سے الگ کر کے دیکھنا چاہتے ہیں' ان کو نہایت غور سے ان تغیرات کا مطالعہ کرنا چاہئے' تاکہ ان کی تدریجی رفتار اور نشوونما کی کمیت و کیفیت سے ان کو کامل واقفیت ہو جائے۔

تمدن کی تاریخ درحقیقت انہی تدریجی تغیرات سے مرتب ہوتی ہے اور اگر ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ وہ دفعتہ" نہایت وسیع پیمانہ پر پیدا ہو گئے ہیں' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اول اور آخر کی کڑیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں' اور بیچ کے انقلابات کو نظرانداز کر دیتے ہیں' یا صرف آخری تغیر کو دیکھتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قوموں کی قوت عقلیہ جس قدر ترقی یافتہ ہو گی' اور ان کا ملکہ جس قدر بلند ہو گا' اسی نسبت سے وہ تمدنی عناصر کو اپنے قالب میں ڈھال سکیں گی' جو چیز ابھی تک پیدا نہیں ہوئی ہے' یا جو چیز ہمارے اخلاق اور احساس کے لئے موزوں نہیں ہے' ہمارا دماغ اس پر ایک دن میں اپنا عمل نہیں کر سکتا' اس قسم کی موروثی چیزوں کی نقل اسی وقت ہو سکتی ہے جب رفتہ رفتہ ان کے ساتھ دوسری موروثی چیزوں کی آمیزش کی جائے' قدیم زمانے میں یونانیوں جیسی ذہین اور طباع قوم نے ایک طویل زمانے کے بعد اشوری اور مصری قوموں کے فنون لطیفہ کی نقل کے دائرہ سے آگے قدم بڑھایا' اور نہایت تدریجی ترقی کے ساتھ ان تمام مدارج کو طے کیا' جن کی بنا پر اس کی صناعیاں عجوبہ روزگار خیال کی جاتی ہیں۔

مصری اور کلدانی قوموں کے سوا تمام قوموں کے سوا تمام قدیم قوموں نے گزشتہ تمدنی عناصر کی نقل کی ہے' اور اس میں ایک مزاج عقلی کے موافق تصرفات کر لئے ہیں' اگر ہر قوم گزشتہ قوموں سے استفادہ نہ کرتی تو تمدنی ترقی کی رفتار نہایت سست ہوتی' اور ہر قوم کی تاریخ کا آغاز بالکل مستقل طور پر ہوتا' ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ آج سے سات آٹھ ہزار برس پیشتر مصریوں اور کلدانیوں نے جس تمدن کو پیدا کیا تھا' اس سے تمام آنے والی قوموں نے فائدہ اٹھایا' یونانی فنون لطیفہ نے دجلہ اور نیل ہی کے کنارے شاخ و برگ نکالے' اور رومی صنعت طرازیوں کی داغ بیل یونانی فنون لطیفہ کی سطح پر ڈالی گئی' رومی طرز

مشرقی موثرات سے متاثر ہوا' اور اس ذریعہ سے پے در پے بیزنٹائن (مشرقی رومی) اور گاتھک طرز پیدا ہوئے' ان سب کا مبداء اگرچہ ایک ہی ہے لیکن ہر قوم کی روح نے ان میں اختلاف پیدا کر دیئے ہیں۔

بعینہ یہی نظریہ تمدن کے دوسرے عناصر یعنی نظام سیاست زبان اور عقائد پر بھی منطبق ہوتا ہے' چنانچہ یورپ کی تمام زبانیں' اس زبان سے نکلی ہیں' جو قدیم زمانہ میں ایشیاء کے ایک حصہ میں بولی جاتی تھی' ہمارا علم قانون رومن لا کا فرزند ہے اور رومن لا بھی ان قوانین سے ماخوذ ہے' جو اس کے پہلے موجود تھے' موسوی مذہب پہلے کلدانیوں کے مذہب کے اختلاط سے پیدا ہوا' اس کے بعد اس میں آرین قوموں کے عقائد شامل ہو گئے' اور اس ترکیب و امتزاج سے وہ مذہب وجود میں آیا' جس کا یورپ تقریباً" دو ہزار برس سے حلقہ بگوش ہے' اسی طرح اگر موجودہ علوم و فنون دور گزشتہ سے متاثر نہ ہوتے' تو آج وہ ترقی کے اس درجہ تک نہ پہنچتے۔ جدید علم ہیئت کے اساطین یعنی کوپر نیک' کپلر' نیوٹن' سب کے سب بطلیموس کے خوشہ چین ہیں جن کی تصنیفات پندرھویں صدی تک اس فن کی نہایت متداول کتابیں تھیں۔ خود بطلیموس مصر کے مدرسہ اسکندریہ کا شاگرد ہے' جو مصریوں اور کلدانیوں کے معلومات کا مخزن تھا' ہم کو قوموں کی تمدنی تاریخ میں جو کمی محسوس ہوتی ہے' اس میں ہم کو اپنے علوم و فنون کی تدریجی رفتار کی جھلک نظر آتی ہے' چنانچہ اگر ہم اس کو پیش نظر رکھ کر گزشتہ دور کی طرف بڑھیں تو گزشتہ تمدنوں کا مطلع بھی صاف روشن ہو جائے گا' اور آج تو علماء ان تغیرات کو سامنے رکھ کر اس زمانہ کے حالات دریافت کرنا چاہتے ہیں جس میں انسانی تاریخ کا وجود نہ تھا' حالانکہ ان سب کا ماخذ ایک ہے' ہر قوم نے اپنے دور ترقی و تنزل میں اپنے مزاج عقلی کے موافق اس میں تغیرات پیدا کر لئے ہیں' اور تمدن کی تاریخ درحقیقت انہی تغیرات کی تاریخ کا مجموعہ ہے۔

اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اجزائے اولین جن کے ذریعہ سے کسی قوم کا تمدن پیدا ہوا ہے' اس قوم کے ساتھ مخصوص اور اس کے عقل

و دماغ کا خلاصہ ہیں' اور جب تک ان میں عظیم الشان تغیر نہ پیدا کرلیا جائے' وہ کسی دوسری قوم کی طرف منتقل نہیں ہوسکتے' یہ تغیر نہایت نمایاں چیز ہے' لیکن کبھی تو ان پر لغوی ضرورتیں پردہ ڈال دیتی ہیں' جن کی وجہ سے ہم مختلف معانی کو ایک ہی قسم کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں' اور کبھی تاریخی ضرورتیں ان کو چھپادیتی ہیں' جن کی وجہ سے تمدن کا دور ابتدائی اور دور انتہائی تو ہمارے پیش نظر ہوجاتا ہے' لیکن بیچ کی وہ کڑیاں جو ان دونوں کو باہم ملاتی تھیں گم ہوجاتی ہیں' لیکن ہم آئندہ فصل میں جس میں فنون لطیفہ کے تغیرات کا ذکر ہے' تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ تمام تمدنی عناصر ایک قوم سے دوسری قوم کے یہاں جاکر کیونکر اپنا قالب بدل لیتے ہیں۔

حاشیہ

(ا) نہیں معلوم مصنف نے ہندوستان کے یہ کس فرقۂ غیر معلوم کی طرف اشارہ کیا ہے شاید اس کا مقصود خوجہ جماعت سے ہے مگر اس کی اس قدر تعداد نہیں' یا عوام قبر پرست مسلمانوں سے ہو۔

تیسری فصل

فنون لطیفہ میں کیونکر تغیر پیدا ہوتا ہے؟

مشرقی قوموں کے فنون لطیفہ پر نظریات سابقہ کی تطبیق' مصر' وہ مذہبی خیالات جو فنون لطیفہ کا مرجع ہوتے ہیں' مصریوں سے منتقل ہو کر جب فنون لطیفہ ایران اور یونان وغیرہ میں آئے تو ان کا کیا حال ہوا۔ ابتدائی زمانہ میں یونانی فنون لطیفہ کا انحطاط' ان کا ست رفتار تغیر یونانی' اشوری اور مصری فنون لطیفہ کا ایران میں آکر رنگ بدلنا' فنون لطیفہ کے تغیرات کا سبب خود قوم ہوتی ہے' نہ کہ مذہبی عقائد جو مختلف قومیں اسلام لائیں' اور ان کے ذریعہ سے عربی فنون لطیفہ میں جو کلی تغیرات پیدا ہوئے ان کے ذریعہ سے اس کی مثالیں ہندوستانی فنون لطیفہ کے ماخذ اور ان کے تغیرات پر ان نظریات کا انطباق' یونان اور ہندوستان دونوں کے فنون لطیفہ کا ماخذ ایک ہے۔ صرف ان دونوں قوموں کے اختلاف نے ہر ایک کے فنون لطیفہ کو دوسرے سے ممتاز اور الگ کردیا ہے۔ ہندوستان میں جو مختلف قومیں آباد ہیں ان کے لحاظ سے علی رغم مذہب فنون لطیفہ میں تغیرات۔

ہم نے اس نظریہ (ا) کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کردیا ہے' کہ ہر قوم کے مزاج عقلی اور اس کے عقائد' زبان' اور نظام سیاست میں ایک خاص مناسبت ہوتی ہے' اگرچہ اس مسئلہ کی کامل تشریح کے لئے متعدد تصنیفات کی ضرورت ہے' تاہم فنون لطیفہ کی بحث کے ذیل میں اس کی کافی توضیح کی جاسکتی

ہے' مذہب اور سیاست ایسی چیزیں ہیں جو تمام قوموں پر یکساں صادق نہیں آتیں' ان میں دقیق تاویلیں کی جاسکتی ہی' اور مختلف زمانوں کے ان مختلف واقعات کو ڈھونڈنا پڑتا ہے' جو قدیم فرسودہ بلکہ مردہ کتابوں کے تہ میں چھپے ہوئے ہیں' اور باوجود اس نقد و بحث کے ان سے کوئی متفقہ نتیجہ نہیں نکلتا' لیکن فنون لطیفہ' بالخصوص فن عمارت کی حالت ان دونوں سے بالکل مختلف ہے' ان کی ایک خاص حد معین ہے اس لئے نہایت آسانی کے ساتھ ان کی تفسیر کی جاسکتی ہے' غرض یہ پتھر کی کتابیں تمام دنیا کی کتابوں سے زیادہ صاف' واضح' اور آسان ہیں' اور ان کی زبان کبھی دروغ بیانی سے آلودہ نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ میں نے مشرقی تمدن پر جو کچھ لکھا ہے' اس میں فنون لطیفہ کو خاص طور پر اہمیت دی ہے۔ میں لٹریری کتابوں سے شدت کے ساتھ احتراز کرتا ہوں' کیونکہ وہ فائدہ کم پہنچاتی ہیں' اور گمراہ زیادہ کرتی ہیں' لیکن آثارِ قدیمہ بہت کم بھٹکنے دیتے ہیں' اور ہمیشہ فائدہ پہنچاتے ہیں' اور قدیم برباد شدہ قوموں کے خیالات کا ان سے زیادہ امین اور محافظ کوئی نہیں ہوسکتا' یہی وجہ ہے کہ مجھے ان نادانوں کی عقل پر جو اپنی تمام تر توجہ صرف ان عمارتوں کے نقش و نگار پر مبذول کرتے ہیں' رونا آتا ہے' اس فصل میں میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ فنون لطیفہ ہر قوم کے مزاج عقلی کا دیباچہ ہوتے ہیں' اور جب وہ ایک تمدن سے منتقل ہوکر دوسرے تمدن کے ساتھ ملتے ہیں' تو ان میں کیونکر تغیرات پیدا ہوتے ہیں؟ میں اپنی بحث کو مشرقی قوموں کے فنون لطیفہ تک محدود رکھوں گا' کیونکہ یورپ کے فنون لطیفہ پر بھی اگرچہ یہ تمام نظریات صادق آتے ہیں' لیکن یہ مختصر کتاب ان تمام تغیرات کی گنجائش نہیں رکھتی جو یورپ کی مختلف قوموں کے یہاں فنون لطیفہ پر طاری ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے میں مصر کے فنون لطیفہ کا ذکر کرتا ہوں' تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ پے درپے تین قوموں' یعنی افریقیوں' ایرانیوں' اور یونانیوں کے یہاں جاکر اس نے کیا کیا رنگ بدلے؟

تمام دنیا کے تمدنی سرمایہ میں مصری تمدن سے زیادہ کامل طور پر کوئی تمدن

فنون لطیفہ سے متعلق رہنمائی نہیں کرسکتا، مصری فنون لطیفہ کو دریائے نیل کے کناروں سے ایک ایسی خصوصیت اور وابستگی ہے کہ جب تک ان کی صورت بدل نہ دی جائے وہ کسی دوسری قوم میں منتقل نہیں ہوسکتے۔

مصری فنون لطیفہ بالخصوص فن عمارت کی ابتداء ایک خاص خیال سے ہوئی ہے اور پورے پچاس صدی تک تمام قوم نے اس خیال کو پیش نظر رکھا، مصریہ چاہتا تھا کہ اس فانی زندگی کے بجائے انسان کے لئے ایک ابدی دارالقرار بنائے، اس بنا پر اس نے مومیات کے ساتھ شدت کے ساتھ اعتناء کیا، جو اب تک وہاں کے مقابر میں دست برد زمانہ سے محفوظ ہیں۔ اس لحاظ سے مصری عمارتوں میں ساتھ ساتھ مذہبی احساسات اور جذبات، دونوں کی جھلک پائی جاتی ہے، وہ مومیات کے لئے تعمیر کی گئی ہیں، بتوں کے لئے ان کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے، اسی غرض سے تہ خانے کھودے گئے ہیں، چٹانیں بلند کی گئیں ہیں، ستون کھڑے کئے گئے ہیں، منارے بنائے گئے ہیں، اور اسی مقصد کے لئے، ابوالہول کے شاندار مجسمے کو چٹانوں کے تخت پر نمایاں کیا گیا ہے، چونکہ یہ عمارتیں صرف اس غرض سے تعمیر کی جاتی تھیں کہ ابدالاباد تک قائم رہیں، اس لئے ان کا ہر جزو نہایت مضبوط، اور عظیم الشان ہے، ان عمارتوں سے مصر کے جذبات اس قدر نمایاں ہوتے ہیں کہ اگر صرف مصری قوم دنیا کی قدیم ترین قوم ہوتی، تو ہم کو اس کے کہنے میں کوئی تامل نہ ہوتا کہ "فنون لطیفہ اس قوم کی روح کا اصلی قالب ہیں جس نے ان کو ایجاد کیا ہے"۔

مصریوں کے بعد مختلف قوموں کا دور آیا، ان میں بعض غیر متمدن تھیں مثلاً" ایتھوپیا کے حبشی بعض متمدن تھیں جیسے ایرانی اور یونانی، ان تمام قوموں نے یا تو صرف مصریوں فنون لطیفہ کی زلہ ربائی کی، یا ان کے ساتھ اشوری قوم کی صناعیوں سے بھی فائدہ اٹھایا۔ بہرحال ان قوموں میں فنون لطیفہ نے جو جو صورتیں بدلیں ان کی تفصیل کے لئے ہم کو سب سے پہلے اہل ایتھوپیا کے فنون لطیفہ کی حالت بیان کرنا چاہیے، جو ان تمام قوموں میں نہایت غیر متمدن تھے۔

مصر کے چوبیسویں خاندان شاہی کے طویل زمانے کے بعد جو اس کی تہذیب

و ترقی کا عہد زریں تھا جب وہاں طوائف الملوکی اور انحطاط کا دور شروع ہوا' تو وفعتہً سوڈانی قوموں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا' اور اس متمدن ملک کے بعض صوبوں پر قابض ہوگئیں' انھوں نے سب سے پہلے اپنا دارالسلطنت شہر نباتہ کو بنایا' اس کے بعد وہ شہر مروی میں منتقل ہوگیا' اور کئی صدی تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہا' ان وحشی قوموں کو مفتوح قوم کے تمدن نے مبہوت کردیا اس لئے انھوں نے اس کے آثار اور فنون لطیفہ کی نقل شروع کی' اس نقل و تقلید نے جو نتائج پیدا کئے وہ ہمارے سامنے ہیں لیکن ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ بالکل طفلانہ تقلید اور فنون لطیفہ کی ایک مسخ شدہ صورت ہے' کیونکہ حبشی قومیں اپنے عقلی تنزل کی بنا پر ہمیشہ وحشت ہی کی حالت میں رہیں' اور اگرچہ ایک مدت تک مصری تمدن نے ان پر اثر ڈالا' تاہم وہ اپنے اصلی دائرہ سے نہ نکل سکیں' قدیم و جدید تاریخ کی کسی مثال سے یہ نہیں ثابت ہوسکتا کہ حبشیوں کی کسی قوم میں بھی کبھی تمدن آیا ہے' اور اگر بخت و اتفاق سے کسی قوم کے ہاتھ میں تمدنی شیرازہ آ بھی گیا' تو وہ بہت جلد درہم برہم ہوگیا' اور انحطاط کی سب سے آخری صورت اختیار کرلی' زمانہ قدیم میں اہل ایتھوپیا (حبشہ) کے یہاں تمدن کا یہی حال رہا' اور موجودہ زمانے میں ہایتی (۲) قوم کا بھی یہی حال ہے۔

اس کے بعد یونانیوں کا دور شروع ہوا اور انھوں نے اول اول مصری اور اشوری قوم کے فنون لطیفہ کی نقل کی' یونانیوں نے ان قوموں کی صناعی کے جو نمونے پیش نظر رکھے تھے وہ ان کو ایک تو فینشین قوم کے ذریعہ سے ہاتھ آئے تھے جس نے بحری راستوں کے ذریعہ سے تمام سواحل میں سلسلہ اتصال قائم کردیا تھا' دوسرے ایشیائے کوچک کی ان قوموں کے توسط سے جنھوں نے نینوی اور بابل کے درمیان تمام خشکی کے راستوں پر قبضہ کرلیا تھا۔

اگرچہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اخیر میں یونانی اپنے استادوں سے بھی بڑھ گئے' تاہم اس زمانے کے محققین آثار قدیمہ کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ان کی ابتدائی کوششیں سخت ناکامیاب اور ناکمل

تھیں، اور ایک طویل زمانے کے گزرنے کے بعد انھوں نے فنون لطیفہ کے ان عجائبات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جو ان کی ابدی یادگار ہیں، چنانچہ وہ سات سو برس کے بعد اس درجہ کو پہنچے کہ انھوں نے فنون لطیفہ کو خاص اپنا فن بنایا، زمانہ سابق کی بہ نسبت زیادہ تر اخیر زمانے میں ان کی ترقیوں کا ظہور ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ تمدنی ترقی میں قوم کو جن دوروں سے گزرنا پڑتا ہے، ان میں دور اخیر کی بہ نسبت دور اول نہایت طویل ہوتا ہے، یونانی فنون لطیفہ کی سب سے زیادہ قدیم مثال سینیا کے خزانے ہیں جو بارھویں صدی قبل مسیح کی یادگار ہیں، لیکن ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرقی مصنوعات کی نقل میں اول اول یونانی بالکل وحشی تھے، اس لئے ان کے فنون لطیفہ کے چہرے سے چھٹے صدیوں تک مشرقی آب و رنگ زائل نہیں ہوا، چنانچہ انیتیا اور اورخومیا میں اپالو (۳) کا جو مجسّمہ نصب ہے وہ مشرقی مجسّموں سے کامل مشابہت رکھتا ہے، لیکن اسی زمانے سے انھوں نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا اور ایک ہی صدی کے بعد پیڈیاس اور پاریتیوں کے مجسّمے منظر عام پر آگئے، جو اپنے ماخذ یعنی مشرقی آب و رنگ سے بالکل خالی ہیں، اور ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔

یہی حال فن عمارت کا بھی تھا، اگرچہ ان تمام دوروں کی تفصیل جن سے اس فن کو گزرنا پڑا ہے، آسان نہیں ہے، کیونکہ نویں صدی قبل مسیح میں ہومر نے جن محلوں کا ذکر کیا ہے، ہم کو ان کی حالت معلوم نہیں ہے، تاہم اس نے ان کی پیتل کی دیواروں، چمکتے ہوئے رنگین کنگروں، اور سونے چاندی کے ان جانوروں کا جو اندر بطور پہرہ دار کے کھڑے کئے گئے ہیں جو حال لکھا ہے، اس کو پڑھ کر ہمیں اشوریوں کے محل یاد آتے ہیں، جو پیتل کے تختوں اور ملمع اینٹوں سے ڈھکے رہتے تھے، اور بیلوں کے مجسّمے ان کی حفاظت کرتے تھے، اس کے ساتھ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یونان میں سب سے زیادہ قدیم ستون جو ساتویں صدی قبل مسیح کی یادگار ہے اس کی مثال کرز، اور بنی حسن واقع ملک مصر میں موجود ہے، اور یونیۃ نامی ستون کے اکثر اجزاء اشوری ستونوں سے ماخوذ ہیں، ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تمام مستعار چیزیں پہلے ایک خاص قوم کی طرف

منسوب تھیں پھر ترکیب و تبدیل نے ان کی صورت اس قدر بدل دی کہ ستونوں کی ایک ایسی نوعیت قائم ہوگئی جو اپنے اصل کے بالکل مخالف معلوم ہوتی ہے، یونانیوں کے بعد ایرانیوں کا ظہور ہوا، اگرچہ انھوں نے بھی یونانیوں کی طرح فنون لطیفہ میں تغیرات پیدا کئے لیکن انقلاب کا یہ دور درجہ کمال تک نہ پہنچ سکا، اسکی وجہ یہ ہے کہ دفعتاً" ایک اجنبی دشمن ان پر حملہ کر بیٹھا، اس لئے ان کے تمدن کی رفتار دفعتاً" رک گئی، یونانیوں کو فنون لطیفہ کی ترقی و ایجاد کے لئے سات صدیاں ملی تھیں، لیکن ایرانیوں کو اس کے لئے دو صدی سے زیادہ کا زمانہ نہ ملا اور اہلِ عرب کے سوا دنیا کی کسی قوم میں اس قسم کی مثال نہیں مل سکتی کہ اس نے ایک محدود زمانے میں فنون لطیفہ میں اس قدر ترقی کرلی کہ اس کو اپنا ایک خاص فن بنالیا۔

ایران کا تاریخی دور اس زمانے سے شروع ہوتا ہے جب قورش اور اس کے جانشینوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو برس پیشتر بابل اور مصر پر قبضہ کرلیا تھا، اور اس وقت یہی دونوں ملک مشرقی تمدن کا ماخذ تھے، لیکن یونان جس کی قسمت میں اسی قسم کی ایک فتح لکھی ہوئی تھی، اب تک گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا، اس بنا پر مسیح علیہ السلام سے تین صدی پیشتر ایرانی سلطنت تمدن کا مرکز بن چکی تھی، لیکن اسکندر نے جب ایرانیوں کو تخت سلطنت سے اتار دیا تو تمدن کا مرکز ثقل دنیا کے دوسرے گوشوں کی طرف منتقل ہوگیا۔

ایرانیوں نے جس وقت مصر اور بابل پر قبضہ کیا تھا، اس وقت ان کا کوئی خاص فن نہ تھا، اس لئے انھوں نے انہی دونوں ملکوں کے نمونے پر فنون لطیفہ میں ترقی کرنا شروع کی، اور انھیں ملکوں سے صناع مستعار لئے، لیکن چونکہ ان کی سلطنت نے دو صدی سے زیادہ کی عمر نہیں پائی اس لئے ان کو فنون لطیفہ میں حقیقی تغیرات پیدا کرنے کے لئے کافی وقت نہیں ملا، البتہ انھوں نے اپنے دور تنزل میں فنون لطیفہ میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنا چاہا، چنانچہ پرسوپولس (اصطخر) کے بچے کھچے کھنڈروں سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے، ہم کو ان میں مصر، اشور، اور یونان تینوں کے فنون لطیفہ کی آمیزش معلوم ہوتی ہے، اور ہم کو یہاں کچھ

جدید آثار بھی نظر آتے ہیں' جن میں اس شہر کا ستون' اور اس کے دو سروں والا تاج خاص طور پر قابل ذکر ہے' ان تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر زمانے نے اس متمدن قوم کو موقع دیا ہوتا تو گو وہ یونانیوں کی طرح فنون لطیفہ میں نظم و ترتیب نہیں پیدا کرسکتی' تاہم ایک طرز خاص کی ایجاد میں وہ اس سے کسی طرح پیچھے نہیں رہتی' چنانچہ اس کے دس صدی کے بعد انھوں نے جو صنعتی یادگاریں قائم کیں وہ زبان حال سے اس کی شہادت دے رہی ہیں' ایران کا سب سے قدیم خاندان اخمیدیوں کا خاندان ہے' جس کو سکندر نے بے تاج و تخت کیا' اسکے بعد سلوقیں (سلوکس یونانی) کا خاندان پیدا ہوا' پھر راشدین کا زمانہ آیا' اور سب سے اخیر میں ساسانیوں کا دور حکومت قائم ہوا جن کو ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے مغلوب کرلیا' انہی ساسانیوں کے زمانے میں ایرانیوں نے فن عمارت کی ایک جدید داغ بیل ڈالی' چنانچہ انھوں نے اس زمانے میں جو عمارتیں تعمیر کیں' ان میں ایک خاص جدت طرازی پائی جاتی ہے' جس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ عرب' اخمیدی' اور راشدی کے فنون لطیفہ سے ماخوذ ہے' بلند دروازے جو جماعت کے کنگروں سے ملے ہوئے نظر آتے ہیں' ملمع اینٹیں' ساٹھ زینے کے پل اسی زمانہ کی مخصوص یادگاریں ہیں اور مغل اپنے مذاق کے موافق کسی قدر تغیر پیدا کرکے اسی فن جدید کو ہندوستان میں لائے۔

ان تمام مثالوں سے تغیرات کے وہ مدارج معلوم ہوتے ہیں' جو ایک قوم دوسری قوم کے فنون لطیفہ میں کرتی ہے' اور ان مدارج کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کے مذاق طبیعت' اور خصوصیات زمانہ کے اختلاف سے ان تغیرات میں بھی اختلاف پیدا ہوجاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ ہم کو مختلف قوموں میں تغیرات کی حیثیت مختلف نظر آتی ہے' اہل افریقہ چونکہ عقلی حیثیت سے کم مایہ تھے' اس لئے باوجود ایک زمانہ طویل کے یہاں فنون لطیفہ نے کوئی ترقی نہیں کی' بلکہ اپنے درجہ سے گرگیا' یونان جیسی متمدن قوم نے جب کافی زمانہ پایا تو قدیم فنون لطیفہ سے انھوں نے ایک جدید فنون لطیفہ کو ایجاد کیا' اور اس کو پہلے سے

بھی زیادہ چمکادیا' اس سے کم درجہ کی متمدن قوم ایرانیوں کی تھی' جس نے ترقی کے لئے بہت کم زمانہ پایا تھا تاہم اس نے غیر قوموں کے فنون لطیفہ کو لیکر اس میں اپنی صناعیوں کے کمالات دکھائے اور اس میں کمالات پیدا کئے۔

عہد قدیم کی ان مثالوں کے علاوہ ہم کو اپنے قریب تر زمانے میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے اس عظیم الشان انقلاب کا پتہ چلتا ہے' جو غیر قوموں کے فنون لطیفہ میں ہر قوم کو خواہ مخواہ کرنا پڑتا ہے' ان مثالوں کی شہادت تمام آثار قدیمہ کی شہادتوں سے زیادہ موثق ہے' کیونکہ وہ اس قوم سے ماخوذ ہیں' جس کی جنسیت اور قومیت میں اگرچہ اختلاف ہے' تاہم وہ صرف ایک مذہب (اسلام) کی پابند ہے۔ جب اہل عرب نے ساتویں صدی عیسوی میں دنیائے قدیم یعنی روم و یونان پر قبضہ کرلیا' اور وہاں اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی جو نہایت سرعت کہ ساتھ اندلس سے لیکر براعظم ایشیا' اور شمالی افریقہ تک پھیل گئی' تو فنون لطیفہ میں سب سے پہلے' ان کی نگاہ فن بیزنطی (مشرقی رومی) پر پڑی' جو نمایاں تشخص و امتیاز رکھتا تھا اس لئے انھوں نے اول اول اندلس' مصر' اور شام کی مساجد میں اسی کی نقل کی' چنانچہ دمشق میں جامع عمری اور قاہرہ میں جامع عمرو اس کی زندہ مثالیں ہیں' لیکن یہ طرز عمارت بہت دنوں تک قائم نہ رہا' بلکہ اختلاف ممالک کی وجہ سے مسلمانوں نے فن تعمیر میں نہایت سرعت کے ساتھ تبدیلیاں شروع کردیں' اور ہر صدی میں یہ طرز بدلتا رہا' چنانچہ ہم نے اپنی کتاب تمدن عرب میں ان تغیرات کی تفصیل کردی ہے' یہ ایک ایسا عام اور کلی تغیر تھا' کہ عہد قدیم کے آثار مثلاً" جامع عمروالواقع مصر ۶۴۲ء اور دور اخیر کی یادگار جامع قاید بای واقع مصر ۱۴۶۸ء میں کسی قسم کی مشابہت اور ہم رنگی نہیں پائی جاتی۔

ہم نے اس کتاب میں تصاویر کے ذریعہ سے دکھایا ہے کہ تمام ممالک اسلامیہ یعنی اسپین' افریقہ' شام' ایران اور ہندوستان کے آثار قدیمہ میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان پر ایک نام کا اطلاق نہیں ہوسکتا' یورپ کے گاتھک طرز میں بھی اگرچہ کسی قدر اختلاف موجود ہے' تاہم ان میں بعض

حیثیتوں سے مشابہت بھی پائی جاتی ہے' اس لئے ان کو ایک ہی چیز کہا جاسکتا ہے' لیکن ممالک اسلامیہ کے آثار قدیمہ میں اس قسم کی مشابہت بالکل مفقود ہے۔

لیکن اس اختلاف کا سبب مذہب نہیں ہوسکتا' کیونکہ تمام دنیائے اسلام صرف ایک ہی مذہب کی پابند ہے بلکہ اس کا اصلی سبب قومیت کا اختلاف ہے' اور وہ ایک ایسی چیز ہے جو خود قوموں کی طرح فنون لطیفہ میں بھی اہم تغیرات پیدا کردیتا ہے۔

پس اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو ہم کو ایک ایسے ملک میں جس میں مختلف قومیں رہتی ہیں' باوجود اتحاد مذہب اور اتحاد سلطنت کے بالکل مختلف قسم کے آثار و عمارات کی تلاش کرنا چاہئے' چنانچہ اگر ہم اس جستجو میں نکلیں گے تو ہندوستان کا گوشہ گوشہ ہمارے سامنے یہ بوقلموں پیش منظر پیش کرے گا' ہندوستان میں اس نظریہ کی بکثرت مثالیں مل سکتی ہیں اور اس لئے میں بار بار اس کی طرف رجوع کروں گا۔

ہندوستان درحقیقت ایک تاریخی کتاب ہے' جس کے آگے حکمت و بیان کی تمام کتابیں ہیچ ہیں' دنیا میں صرف وہی ایک ایسا ملک ہے' جہاں سیاح ایک طرف سے نکل کر دوسری طرف کو جاتا ہے' تو گویا ایک زمانے سے نکل کر دوسرے زمانے کے حدود میں قدم رکھتا ہے' اور انسانیت نے ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک وحشت اور تمدن کے جو مراحل طے کئے ہیں وہ بیک وقت اس کی نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں' تمام دنیا کے انقلابات کی تصویریں وہاں موجود ہیں' نجار اور کہربائیت کا ترقی یافتہ دور بھی وہاں اپنے مناظر دکھا سکتا ہے' اور اس کے ساتھ عصر حجری کی یادگاریں بھی وہاں موجود ہیں' غرض تمدنی موثرات' اور اس کے مسلسل تغیرات کا مرقع ہندوستان سے بہتر دنیا کے کسی حصہ میں نظر نہیں آسکتا' میں مدت سے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستانی فنون لطیفہ کا ماخذ کیا ہے؟ لیکن ان نظریات کی تطبیق سے یہ عقدہ نہایت آسانی کے ساتھ حل ہوگیا۔

ہندوستان میں تاریخی دور کے بہت بعد فنون لطیفہ کا رواج ہوا' چنانچہ

ہندوستان کے قدیم ترین آثار کی عمر یورپ کے تاریخی دور کے دو صدیوں سے زیادہ نہیں ہے' مثلاً" اشوکا (۴) کے ستون' کارلی' ہوتا اور میش کی عبادت گاہیں جس زمانے میں تعمیر کی گئی ہیں' اس وقت مصر' ایران' اور اشور کی قدیم قوموں کا تمدن اپنا دور ختم کرچکا تھا' اور اس پر تنزل و گمنامی کے پردے پڑگئے تھے' اس وقت صرف ایک روما کا تمدن اپنے اوج شباب کے ساتھ تمام دنیا پر حکومت کررہا تھا' اگرچہ ہندوستان ان اقوام قدیمہ کو جن کے تمدن و تہذیب کا چراغ بجھ رہا تھا' اپنے تمدن کے ایک بڑے حصہ کا ماخذ بناسکتا تھا' لیکن چونکہ وہ تمام دنیا سے الگ تھلگ ایک گوشہ میں پڑا ہوا تھا' اور خود ہندوستانی عمارتوں کی شخصیت کسی قوم کے آثار و عمارات سے میل نہیں کھاتی تھی' اس لئے ایک مدت تک علمائے آثار قدیمہ کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان نے ان قوموں سے کچھ نہیں لیا' اس خصوصیت کے ساتھ اگر ہندوستانی آثار قدیمہ کے' نظام و ترتیب اور جدت طرازیوں کو پیش نظر رکھا جائے' تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام آثار مسلسل اور دیرینہ تجارب کا نتیجہ ہیں' لیکن علمائے آثار قدیمہ اب تک ان تجربات سے ناواقف ہیں' اخیر زمانے میں ہندوستان کے ایک دور افتادہ حصے میں کچھ مجسمے بلا شبہ نکلے تھے جن میں یونانی فنون لطیفہ کی جھلک پائی جاتی تھی' اور اسی بنا پر ان علماء نے جو ہندوستان میں آثار قدیمہ کی تحقیقات کررہے تھے یہ رائے قائم کی تھی' کہ ہندوستان نے فنون لطیفہ کو یونان سے لیا ہے' لیکن ہم نے ان نظریات کی بنا پر جن کو ہم اس کتاب میں لکھ چکے ہیں' اور خود ان آثار قدیمہ کے دقیق مطالعہ کے بعد جو نتیجہ مستنبط کیا ہے وہ ان علماء کی رائے سے بالکل مختلف ہے' ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان نے فنون لطیفہ کو یونانیوں سے اخذ نہیں کیا' اور باوجود تمدنی اختلاط کے ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا' کیونکہ یہ دونوں قومیں قومیت' خیالات' اور فنون لطیفہ کی مہارت میں باہم اس قدر مختلف تھیں کہ ان موانع کے ہوتے ہوئے ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا بالکل ناممکن تھا' ہندوستان میں جو آثار قدیمہ پھیل ہوئے ہیں' اگر ان کی تحقیقات کی جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں ملکوں کے فنون لطیفہ میں کسی قسم کی مناسبت نہیں ہے'

یورپ کے تمام آثار قدیمہ یونانی فنون لطیفہ کی جھلک دکھا رہے ہیں' لیکن ہندوستانی آثار میں ہم کو ان کا کوئی اثر نظر نہیں آتا' سرسری طور پر بھی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یونانیوں اور ہندوستانیوں سے زیادہ دنیا کی کسی قوم میں تنافر و اختلاف نہیں ہے' چنانچہ ہندوستان کے آثار قدیمہ اور ہندوستانی قوم کی نفسی خصوصیات پر جس قدر بحث کی جاتی ہے' اسی قدر یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ "ہندوستانی قوم ایک مخصوص اور مستقل روح رکھتی ہے جو کسی خارجی اور اجنبی موثر سے متاثر نہیں ہو سکتی" البتہ ایک اجنبی موثر جبراس کو اپنے زیر اثر لاسکتا ہے' لیکن جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا' یہ اثر زائل ہو کر محض سطحی اور عارضی رہ جائے گا' بالکل سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ممالک کے درمیان جس قدر بعد و مسافت ہے' اسی قدر ہندوستان کی مختلف قومیں' دنیا کی دوسری قوموں سے الگ ہیں' ہندوستان کی قومی روح بالکل ایک مستقل چیز ہے' اور اگر وہ کسی چیز کی تقلید بھی کرتی ہے تو اس کو خود ہندوستانی قالب میں ڈھال لیتی ہے' یہی عجیب و غریب روح جو ہر چیز کی حقیقت کو بدل دیتی ہے' علانیہ فن عمارت میں بھی نظر آتی ہے' ہندوستان کے ایک سنگ تراش کو یونانی وضع کے بت بنوانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے' لیکن وہ چند ہی دنوں میں اس میں اس قدر تغیر پیدا کردے گا' کہ وہ ہندوستانی بت بن جائے گا' اگرچہ ہندوستان اس وقت یورپ کے زیر اثر ہے' تاہم وہاں اس قسم کے تغیرات روز بروز بڑھتے جاتے ہیں' اگر تم ایک ہندوستانی کاریگر کو کسی یورپین چیز کا نمونہ دیدو کہ وہ خود اسی وضع کی دوسری چیز تیار کردے تو گو وہ عام طور پر نمونہ کی ظاہری شکل و صورت کا لحاظ رکھے گا' لیکن وہ اسکے نقش و نگار' اور بعض اجزاء میں اس قدر تغیر و تبدل کردے گا' کہ دوسری یا تیسری باری میں اس سے یورپین آب و رنگ بالکل اتر جائے گا' اور وہ خالص ہندوستانی چیز بن جائے گی۔

ہندوستانی فن تعمیر کا سب سے بڑا مابہ الامتیاز وصف یہ ہے کہ اس میں جزئیات کی نہایت کثرت ہوتی ہے اور اس کی ترکیب میں پیچیدگی پائی جاتی ہے' اس کے بخلاف یونانی فن عمارت اپنی سادگی میں ممتاز نظر آتا ہے' یہی خصوصیت

ہندوستانی فن ادب میں بھی موجود ہے اور اسی وجہ سے ان دونوں فنون (فن تعمیرات و فن ادب) میں تقریبا" اتحاد پیدا ہوگیا ہے' ہندوستانی فنون لطیفہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے مزاج عقلی اور اینٹ پتھر کی ان صناعیوں میں سخت مناسبت اور تعلق ہے' اور وہ زبان حال سے اس کی شہادت دے رہی ہیں' چنانچہ اگر اشوری قوم کی طرح ہندوستانی بھی مٹ جائے تو ان کی عبادت گاہوں کے نقش و نگار ان کے مصنوعی بت' اور ان کی قدیم عمارتیں' ان کی گزشتہ تاریخ پر شہادت دے گی' اور ان سے ہم کو خاص طور پر یہ معلوم ہوگا کہ ہندوستانی قوم میں چونکہ ترتیب و نظام کا ملکہ نہ تھا' اور ان میں خیالی قوت شدت کے ساتھ موجودہ تھی اس لئے وہ یونانیوں کے فن تعمیر سے بالکل متاثر نہیں ہوئی یعنی ان عمارتوں میں وہ حسن ترتیب' اور صفائی نہ پیدا کرسکی جس نے یونانیوں کو تمام دنیا سے ممتاز کردیا تھا اور اس طرح ہم کو اس سبب کا علم ہوجائے گا' جس کی بنا پر یونانیوں کا اثر بالکل عارضی طور پر ہوا' اور جس قدر اول اول ہوا تھا اس سے آگے نہ بڑھا' ان آثار پر غور و فکر کرنے سے اس خیال کی صداقت کو بہ دلائل ثابت کیا جاسکتا ہے' جو ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے' جو ہندوستانی قوم کی عقلی خصوصیات سے اجمالی واقفیت رکھتے ہیں' کیونکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ سلاطین ہند اور شاہان ایران (ارجندی) میں باہم تعلقات قائم تھے' او ایرانی تمدن یونانی اثر سے خاص طور سے متاثر تھا' ہندوستان کے بادشاہوں نے متعدد بار بالخصوص سن عیسوی کی دو ابتدائی صدیوں میں یونانی فنون لطیفہ کو ہندوستان میں منتقل کرنا چاہا' لیکن وہ اس کو قائم نے رکھ سکے' بلکہ جن بادشاہوں نے اس قسم کی کوشش کی تھی' ان کی حکومت کے زوال کے ساتھ وہ بھی مٹ گیا' اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ یونانی فنون لطیفہ' اور ہندوستانی قوم کے مزاج عقلی میں اس قدر تنافر اور اجنبیت تھی کہ وہ ان کو صرف سلطنت کی جبری قوت سے قبول کرسکتی تھی' بلکہ تنافر کا اثر اس درجہ نمایاں تھا کہ خود ان بادشاہوں کے زمانے میں بھی ہندوستان کا ملکی فنون لطیفہ یونانی فنون لطیفہ سے بالکل متاثر نہیں ہوا' کیونکہ خود اس زمانے میں بلکہ اس کے

بعد بھی ہندوستانیوں نے جو عمارتیں تعمیر کیں ہم کو ان میں یونانی فن تعمیر کا اثر نظر نہیں آتا' حالانکہ وہ اثر اس آسانی کے ساتھ نمایاں ہوسکتا ہے' کہ ایک کامل ہندی وضع کی عمارت میں صرف بعض جزئیات بالخصوص فرش سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کو یونانی کاریگر نے تعمیر کیا ہے۔

یونانی فنون لطیفہ' اور ہندوستانی قوم کے جذبات کے اختلاف و تبائن کا یہ نتیجہ ہوا کہ جس طرح یونانی فنون لطیفہ دفعتا" ہندوستان میں آیا تھا' اسی طرح دفعتا" فنا بھی ہوگیا' اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک میں بزور حکومت آیا تھا' کیونکہ کسی قوم کا فنون لطیفہ اس طرح جلد فنا نہیں ہوتا' بلکہ اس میں تغیرات ہوتے ہیں تبدیلیاں ہوتی ہیں' اور جدید فنون لطیفہ کا اثر قدیم فنون لطیفہ میں صاف نظر آتا ہے' لیکن یونانی فنون لطیفہ دفعتا" ہندوستان میں آیا' اور دفعتا" فنا ہوگیا' اور جس طرح آج ہندوستانی طرز تعمیر پر ان عمارتوں کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہوتا جن کو انگریز دو سو برس سے ہندوستان میں تعمیر کررہے ہیں' اسی طرح ہندوستان میں یونانی فنون لطیفہ بھی بے اثر رہا۔

یورپ اگرچہ ہندوستان پر ایک صدی سے حکومت کررہا ہے' لیکن جس طرح آج سے ۱۸ سو برس پیشتر یونانی فنون لطیفہ بے اثر تھا اسی طرح یورپین فنون لطیفہ کا بھی ہندوستان پر کوئی اثر نہیں پڑا' صاف نظر آتا ہے کہ فنون لطیفہ کی ترتیب و نظام کے متعلق دونوں قوموں کے خیالات سخت مختلف ہیں' اور اسی بنا پر اگرچہ ہندوستانیوں کے نزدیک اہل عرب بھی یورپین قوموں کی طرح بیگانہ تھے' لیکن کل ہندوستان نے عرب کے فنون لطیفہ کی تقلید کی' چنانچہ ملک کے جن حصوں پر اہل عرب کا اثر نہیں پڑا' وہاں کی عبادت گاہیں عربی نقش و نگار سے خالی نظر آتی ہیں' یہ سچ ہے کہ جس طرح زمانہ قدیم میں شاہ کیشکا (۵) نے اپنے دَورِ حکومت میں یونانی فنِ تعمیر کو منتقل کیا تھا' اسی طرح آج بھی چند راجہ مثلاً" مہاراجہ گولیار نے یورپین طاقت سے مبہوت ہوکر قدیم لیٹن' اور یونانی طرز پر یورپین وضع کے محل تعمیر کیے ہیں' لیکن کیشکا کے زمانے کی طرح خود ملکی فن عمارت' اس سرکاری فن عمارت سے بالکل متاثر نہیں ہوا' اس سے صاف ثابت

ہوتا ہے کہ اگرچہ یونانی اور ہندوستانی فن تعمیر نے گزشتہ زمانے میں بعینہ اس طرح دوش بدوش زندگی بسر کی جس طرح آج وہ یورپین فن عمارت کے ساتھ زندگی بسر کررہا ہے' تاہم ان میں کسی نے اپنے ہم نشین کا اثر قبول نہیں کیا' اور اس بنا پر یونانی اور ہندوستانی آثار قدیمہ میں کلا" و جزا" دور کی مناسبت بھی نہیں معلوم ہوتی' یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہندوستان کے آثار قدیمہ کے مطالعہ سے صاف نمایاں ہوسکتی ہے' لیکن اس کا یہ سبب نہیں ہے کیونکہ جن قوموں کے فنون لطیفہ ان کے مذاق کے موافق تھے' اس کی نقل انھوں نے کرلی ہے' بلکہ اس کی اصل وجہ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں یہ ہے کہ دونوں کی روح میں سخت تنافر و اختلاف ہے۔

عمارتوں کے مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی قوموں نے ابتداء میں ایرانیوں سے فنون لطیفہ کو لیا' لیکن یہ سلاطین ارخیدئین کے زمانے کے ایرانی نہ تھے' بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اشوری اور مصری قوموں سے تمدنی سبق سیکھا تھا' یہ مسلم ہے کہ ۳۳۰ قبل مسیح میں جب سکندر نے سلاطین اخمیدئین کے نظام سلطنت کو درہم برہم کردیا' اس کے دو برس پہلے سے ایران ایک شاندار تمدن کا مالک تھا' یہ سچ ہے کہ اس وقت انھوں نے فنون لطیفہ میں کوئی خاص جدت نہیں پیدا کی تھی' تاہم مصری اور اشوری فنون لطیفہ کی آمیزش نے ان کی صناعیوں کو ایک نئے قالب میں نمایاں کیا تھا' چنانچہ پرسوپولس (اصطخر) کے بچے کھچے آثار سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے' جن میں مصر کے عظیم الشان دروازے اور اشور کے پردار بیل نظر آتے ہیں' اور کہیں کہیں یونانی فنون لطیفہ کی جھلک بھی نظر آتی ہے' ان تمام واقعات کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی تمام عظیم الشان قوموں کے فنون لطیفہ ایشیاء کوچک میں سمٹ کر آگئے تھے۔

بہرحال ہندوستانیوں نے اگرچہ براہ راست ایرانیوں سے فنون لطیفہ کو حاصل کیا' لیکن درحقیقت یہ وہی کلدان اور مصر کے فنون لطیفہ تھے کیونکہ خود ایرانیوں نے انہی قوموں سے فنون لطیفہ کی تعلیم پائی تھی' اور ان میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کیا تھا' ہندوستانی آثار قدیمہ کی کی تحقیقات سے اس ماخذ کا پتہ چلتا

ہے' جس سے ابتداء میں انھوں نے فائدہ اٹھایا تھا' اس لحاظ سے جو لوگ اس حقیقت کا سراغ لگانا چاہتے ہیں' ان کو اپنا مطمح نظر صرف ہندوستانی قدیم ترین آثار کو بنانا چاہئے' کیونکہ ہندوستانی روح کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جس جدید روش کو اختیار کرتی ہے' اس میں چند ہی دنوں کے بعد اس قدر تغیرات پیدا کردیتی ہے' کہ نقل و اصل میں کلیتا" اختلاف پیدا ہوجاتا ہے' ہندوستانیوں نے یونانیوں کو چھوڑ کر صرف اس بناء پر ایرانیوں سے فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کی کہ ایرانی فنون لطیفہ کو ہندوستانی مزاج عقلی سے جو مناسبت تھی وہ یونانی فنون لطیفہ کو نہ تھی' کیونکہ یونانی عمارتیں بالکل سادہ اور نقش و نگار سے خالی ہوتی ہیں' اس لئے ہندوستانی قوموں کو ان سے کوئی دلآویزی نہیں پیدا ہوتی تھی اس کے بخلاف ایرانی آثار میں نقش و نگار' زیب و زینت' اور سامان آرائش کی اس قدر کثرت ہوتی ہے جو ہندوستانیوں کے دلوں کو فریفتہ کرلیتی ہے' اور یہ ایک ایسی فطری مناسبت تھی کہ ایرانی فنون لطیفہ نے صرف زمانہ قدیم ہی میں جبکہ ایران مصر اور اشور کے تمدن کا مالک تھا ہندوستان پر اثر نہیں ڈالا' بلکہ اس کے کئی صدیوں کے بعد جب مسلمانوں نے ہندوستان کی فتح کیا تب یہ اثر نمایاں ہوا' جس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں آنے سے پہلے ایرانی ممالک میں مسلمانوں کا گزر ہوچکا تھا' اور ان کا تمدن قدیم قوموں کے تمدن سے بہت کچھ سرمایہ حاصل کرچکا تھا اس لئے مسلمان ایرانی فنون لطیفہ کو خاص طور پر ہندوستان میں لائے' لیکن ان میں اشوری قوم کے آثار قدیمہ کی جھلک بھی نظر آتی ہے' عظیم الشان مسجدوں کے دروازے اور ملمع اینٹیں صرف اشوری اور کلدانی قوموں کی یادگاریں ہیں' چونکہ یہ تمام فنون لطیفہ ہندوستانیوں کے جذبات کے موافق تھے' اس لئے انھوں نے اس کی نقل کی' لیکن قدیم یونانی' اور موجودہ یورپین فنون لطیفہ چونکہ ہندوستانیوں کے مذاق کے بالکل مخالف ہے' اس لئے ہندوستانیوں پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ ہندوستانی اور یونانی فنون لطیفہ میں جیسا کہ علمائے فن عمارت کا خیال ہے' کوئی تعلق نہیں ہے' بلکہ ایرانیوں کے ذریعہ سے

انھوں نے مصر اور اشور سے راہ و رسم پیدا کی ہے' اس لحاظ سے اگرچہ ہندوستان نے براہ راست یونان سے کچھ نہیں لیا' لیکن درحقیقت ان دونوں کا مآخذ تمدن کا وہ عام سرچشمہ اور تہذیب کا وہ عام خزانہ ہے جس کو ایک مدت میں مصر اور اشور نے جمع کیا تھا' ہندوستان اور یونان دونوں کا راس المال صرف وہی ہے' البتہ اتنا فرق ہے کہ یونانیوں نے فینقی (فینشین) قوم اور ایشیائے کوچک کے رہنے والوں کے ذریعہ سے اس سے فائدہ اٹھایا' اور ہندوستانیوں نے ایرانیوں کے توسط سے اس سرمایہ کو اپنے یہاں منتقل کیا' اسی بنا پر اصل میں یونانی اور ہندوستانی تمدن کا مبداء ایک ہے' البتہ چونکہ ان دونوں قوموں کی روح میں اختلاف تھا' اس لئے تمدن کی ان دونوں شاخوں میں بھی الگ الگ خصوصیتیں قائم ہوگئیں۔

چونکہ فنون لطیفہ کو ہر قوم کے مزاج عقلی کے ساتھ خاص تعلق ہے' اور اسی بنا پر قوموں کے اختلاف سے اس میں بھی اختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے' اس لئے باوجود مذہبی اتحاد کے قومیت کے اختلاف سے ہندوستانی فنون لطیفہ میں جن اختلافات کا پیدا ہونا لازمی تھا وہ پیدا ہوئے چنانچہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو آثار موجود ہیں وہ اس کی شہادت دیتے ہیں' ان کے طرز تعمیر میں باہم اس قدر اختلاف ہے کہ مذہبی عقائد کو چھوڑ کر ہم کو اس کی ترتیب و تقسیم میں ملکی یعنی قومی حیثیت کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا' شمالی ہند اور جنوبی ہند کی عمارتیں اگرچہ ایک ہی زمانے میں تعمیر کی گئیں اور ان تعمیر کرنے والوں کا مذہب بھی ایک تھا' تاہم ان میں باہم کسی قسم کی مشابہت نہیں پائی جاتی' مسلمانوں کے زمانے میں بھی جبکہ تمام ہندوستان ایک طاقتور سلطنت کے زیر اثر تھا' یہ اختلاف قائم رہا' اور ملکی اختلافات کے لحاظ سے خود اسلامی آثار میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے' چنانچہ احمد آباد' آگرہ اور بیجاپور کی مسجدیں اگرچہ صرف ایک خدا کی پرستش کے لئے تعمیر کی گئیں' لیکن ان میں بہت کم مشابہت پائی جاتی ہے' اور یورپ کے دور ترقی کے آثار اور گاتھک آثار میں جو معمولی درجہ کی مشابہت ہے' وہ ان مساجد میں اس سے بھی کم پائی جاتی ہے۔

یہ اختلاف صرف عمارتوں تک محدود نہیں، بلکہ وہ مجسموں کی ہیئت اور صنعت دونوں سے نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ سانش کے ابھرے ہوئے نقش و نگار، اور برہات کے مجسموں کے موازنہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، حالانکہ یہ سب ایک ہی زمانے میں بنائے گئے ہیں، اور بوندی کھنڈ، میسور اور جنوبی ہند کے آثار میں یہ اختلاف اور بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے، یہاں تک کہ معمولی درجہ کی مصنوعی چیز بھی اس کے اثر سے خالی نہیں نظر آتی، میسور، اور گجرات کے بنے ہوئے لکڑے کے کام اور اڑیسہ اور ساحل بمبئی کے بنے ہوئے زیور میں ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی امتیاز کرسکتا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ دیگر مشرقی عمارتوں کی طرح ہندوستان میں بھی سب سے پہلے مذہبی عمارتیں وجود میں آئیں، لیکن مشرق میں جس قدر مذہب کا اثر ہے، اس سے زیادہ خود قوم کا ہے۔

یہ روح جو ہر قوم کو اس کی منزل مقصود تک پہنچاتی ہے، وہ جس طرح نظام سیاست اور فنون لطیفہ پر اپنا اثر ڈالتی ہے، اسی طرح مذہب کو بھی ایک خاص روش کی طرف لے جاتی ہے، وہ تمام تمدنی عناصر کی بحث میں ہمارے آگے آگے ہوتی ہے، اور وہ ایک ایسی طاقت ہے جس سے بالاتر کوئی طاقت نہیں، اس میں ان ہزاروں پشتوں کی قوت موجود ہے، جس نے اس کو پیدا کیا ہے، اور وہ ان کی نسلوں کے افکار و خیالات کا خلاصہ ہے۔

حواشی

(۱) افسوس ہے کہ اس فصل میں عمارتوں اور شہروں کے نام آتے ہیں، ہم ان میں اکثر کی تصحیح نہ کرسکے اور ان کے اجمالی حالات نہ دے سکے۔

HAYTI امریکہ کا ایک جزیرہ جہاں کے باشندے حبشی ہیں۔

(۳) ہومر کی اصطلاح میں رب الارباب عقل و فہم، شاعری و موسیقی کا سب سے بڑا دیوتا، بمبئی کا اپالو بندر اسی کی طرف منسوب ہے۔

(۴) ہندوستان میں بدھ مذہب کا بہت مشہور بادشاہ، مدت سلطنت ۲۷۳ ق م اس نے متعدد ستون نصب کرائے تھے جن پر اخلاقی احکام و قوانین کندہ تھے۔

(۵) اس کی حکومت کابل اور کشمیر سے لے کر دریائے نربدا تک تھی' پشاور دارالسلطنت تھا' سال تخت نشینی بہ اختلاف روایات ۷۸ یا ۱۱۸۔

تیسرا باب

قوموں کی تاریخ پر' اس حیثیت سے نظر کہ اس کا ماآخذ قوموں کا اخلاق ہے

پہلی فصل

نظامات سیاسیہ کیونکر ہر قوم کی روح سے پیدا ہوتے ہیں؟

ہر قوم کی تاریخ عموماً" و دائماً" اس کے مزاج عقلی سے ماخوذ ہوتی ہے' اس کی مختلف مثالیں یہ بحث کہ فرانس کی سیاست کا منبع وہاں کی قومی روح ہے' یہ بحث کہ نظامات میں اگرچہ بظاہر تغیر محسوس ہوتا ہے لیکن ان کی حقیقت نہایت راسخ و پائدار ہوتی ہے' یہ بحث کہ ہمارے تمام سیاسی فرقوں کا مقصد ایک ہے' ان فرقوں کے رنگ اور ان کے نام' یہ بحث کہ تمام سیاسی فرقوں کا مذہب یہ ہے کہ نفوذ و قوت کو محدود' اور ہر شخص حرکت کو حکومت کے مصالح پر قربان کردیا

جائے' یہ بحث کہ شورش فرانس شخصی حکومت کے قائم ہونے سے پیدا ہوئی' یہ بحث کہ ہر قوم کے سیاسی نظام کا ماخذ ہمیشہ اس کا قومی نظامِ اخلاق ہوتا ہے۔

تاریخ اپنی حیثیت عمومی میں ان نتائج کی شرح ہے جن کو قوموں کی روح نے پیدا کیا ہے اس لئے جس طرح مچھلی کے آلات تنفس کی نشوونما پانی میں ہوئی ہے' اسی طرح تاریخ کا سرچشمہ بھی قوموں کی یہی روح ہے' جو شخص کسی قوم کے مزاج عقلی سے ناواقف ہے' اس کے نزدیک اس کی تاریخ ان غیر مرتب واقعات کا مجموعہ ہوگی جن کو بخت و اتفاق نے پیدا کیا ہے' لیکن جو شخص اس روح کی حقیقت سے واقف ہے' اس کو نظر آتا ہے کہ قومی زندگی ہر قوم کے نفسی اخلاق کا ایک قدرتی اور لازمی نتیجہ ہے' اگر تم کو مختلف قوموں کے مظاہر زندگی مختلف نظر آئیں' تو تم کو یقین کرلینا چاہئے کہ ان اختلافات کے تار و پود قومی روح سے وابستہ ہیں۔

قومی روح کا روشن ترین مظہر نظام سیاست ہے' اور بعض مثالوں کے ذریعہ سے نہایت آسانی کے ساتھ یہ حقیقت واضح ہوسکتی ہے۔

فرانس ان ملکوں میں ہے' جن میں ایک عام انقلاب پیدا ہوچکا ہے' بظاہر چند سالوں میں اس کا نظام سیاست بالکل بدل گیا ہے' اور سیاسی فرقوں میں سخت مغائرت پیدا ہوگئی ہے' لیکن اگر ہم ان خیالات کا جو بظاہر متناقص معلوم ہوتے ہیں' غور سے مطالعہ کریں اور ان سیاسی فرقوں کے متعلق جن میں ہمیشہ جنگ قائم رہتی ہے' وقت نظری سے کام لیں' تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی حقیقت ایک ہے اور اس کے اندر سے فرانس کی قومی روح علانیہ جھلک رہی ہے' انتہا پسند' شخصیت پرست' سوشلسٹ غرض تمام فرقے مختلف رنگ کی جھنڈیوں کے نیچے' ایک ہی منزل مقصود کی طرف جارہے ہیں اور سب کا نصب العین صرف یہ ہے کہ افراد کو حکومت کے اندر فنا ہوجانا چاہئے' ہر فرقہ یہ چاہتا ہے کہ قوت نفوذ سلطنت کے دامن میں اس طرح سمٹ کے آجائیں' کہ ہر چیز کی باگ اس کے ہاتھ میں آجائے' سلطنت ہی ہر چیز کی ترتیب دے' اسی کی طرف تمام چیزیں

سمٹ آئیں، معمولی سے معمولی جزئیات کے متعلق بھی وہ افراد کی زندگی کو قانونی شکنجہ میںل جکڑدے، اور ان کو تھوڑا بہت دنیا کے جھگڑے بکھیڑے سے نجات دلائے، بادشاہ، شاہزادہ (امبر اطوار) پریسیڈنٹ، غرض عنان حکومت کسی کے ہاتھ میں بھی ہو، لیکن مقصد سب کا ایک ہے، اور یہی مقصد فرانس کی قومی روح کی ترجمانی کرسکتا ہے، اور فرنچ قوم اس کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف نہیں جاسکتی۔ (۱)

پس ایک طرف تو ہمارے نظام عصبی کا تموج، اور ہمارا آسانی کے ساتھ بدلنے والا مذاق ہم سے کہتا ہے، کہ "کاش اس حکومت کے بجائے جو ہروقت اپنا نظام سیاسی بدلتی رہتی ہے، کوئی دوسری حکومت ہوتی تو ہماری حالت بہتر ہوجاتی" دوسری طرف سے مردوں کی آوازیں آتی ہیں کہ "ہم صرف الفاظ اور ظاہری قالب میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں" لیکن قوم کی غیر شاعرانہ روح کا اثر ہم پر اس شدت کے ساتھ پڑگیا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہمارا موجود خیال بالکل غلط ہے۔

شورش فرانس کے بعد جو نظام حکومت قائم ہوا، اس کو اگرچہ ہمارے قدیم نظام سے بظاہر کوئی مناسبت نہیں ہے، لیکن درحقیقت اس نے غیر محسوس طور پر شخصی حکومت کا قالب اختیار کرلیا، اس لئے اس نے قدیم نفوذ قوت کو اور بھی محدود کردیا، اگر لوئس سیزدہم اور لوئس چہاردہم اپنی قبر سے اٹھ کر اس انقلاب کے نتائج کو دیکھتے، تو اپنے شخصی اغراض کے لئے انھوں نے جو بیر میاں کی تھیں اس پر اگرچہ فطرتاً ملامت کرتے، لیکن بااین ہمہ ان کو نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ٹھیک ان کی قدیم روش کے مطابق ہے، وہ اعتراف کرتے کہ اگر انھوں نے کسی وزیر کو اس طرز حکومت کی وصیت کی ہوتی، تو اس کو بہت زیادہ کامیابی نہ ہوتی، وہ کہتے کہ شورش سے پہلے فرانس میں جو حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ قدیم خود وہ نظام حکومت ہے، جو شورش کے بعد قائم ہوا ان کو اس امر کا یقین ہوجاتا کہ اگرچہ تقریباً" ایک صدی سے مختلف طرز کی مختلف حکومتیں قائم ہوتی رہیں، لیکن ان میں کوئی بھی قدیم نظام کو نہ بدل سکی، کیونکہ

جو انقلاب قانونی طبعی کے مطابق ہوتا ہے' اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہے' اور سلاطین کی شخصی تقلید جس نے قوم کی روح کو غلام بنالیا ہے' ہمیشہ اسی طرح قائم رہے گی' تاہم ان کو یہ فرق ضرور نظر آتا کہ جب سے حکام و شرفاء کے طبقہ کو ملازمت پیشہ لوگوں کے گروہ سے بدل دیا گیا ہے' ایک ایسا جمہوری نظام قائم ہوگیا ہے' جو قدیم نظام سے زیادہ خطرناک ہے' کیونکہ اس میں کوئی سیاسی انقلاب نہیں پیدا ہوسکتا' اس سے پہلے دوسرے نظام قائم ہوچکے ہیں' وہ قوم کا قدرتی کفیل ہے' اس کے نتائج کی ذمہ داری کسی خاص شخص پر عائد نہیں ہوتی' اور اس کی مستمر زندگی سے روز بروز اس کا بول بالا ہوتا جاتا ہے" اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو ایک شخصی حکومت کا خاصہ لازمی خیال کی جاتی ہیں' لیکن بااین ہمہ وہ اس پر بہت زیادہ ملامت نہیں کریں گے' کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ لیٹن قومیں آزادی سے زیادہ مساوات پر جان دیتی ہیں اس لئے وہ تمام استبدادی طریقوں کو اس شرط پر قبول کرسکتی ہیں' کہ ان کا سررشتہ ایک فرد کے ہاتھ میں نہ ہو' یادداشتوں کی کثرت' اور قواعد کی بہتات نے افراد کو جس طرح جکڑ کر استبداد کی قوت میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے وہ ان سے مخفی نہیں رہ سکتا' ان نتائج پر نگاہ ڈالنے سے ان کو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ جب اس دور حکومت کا نظام مکمل ہوجائے گا' تو وہ ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گا' اور پھر تمدنی فوائد کے لئے کسی قسم کے قانون کی ضرورت نہ ہوگی' افراد کی ہر شخصی حرکت فنا ہوجائے گی' اور بغیر کسی دوسری شورش کے سوشیلزم تمام ملک میں لنگر انداز ہوجائے گا' لیکن اس کے ساتھ ان کو شاہانہ دماغ کی روشنی میں یہ بھی نظر آئے گا کہ سوشیلزم درحقیقت' شخصی نظام حکومت کا ایک اعلیٰ ترین مظہر ہے' اور شورش فرانس نے اس بلند منارہ تک ملک کو نہایت سرعت کے ساتھ پہنچا دیا ہے اس مثال کے مقابل میں انگریزی قوم ہے جس کا مزاج عقلی فرنچ قوم سے بالکل مختلف ہے' اور اسی وجہ سے دونوں کے نظام حکومت میں کسی قسم کا ارتباط اتصال نہیں پایا جاتا۔ انگریزی حکومت کے تخت پر بادشاہ پریسیڈنٹ کوئی بھی متمکن ہو' جیسا کہ برطانیہ اور ولایات متحدہ امریکہ میں یہ دونوں مختلف حالتیں

نظر آتی ہیں' لیکن انگریزی قوم کے طرز حکومت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پیدا ہوتا ان دونوں حالتوں میں سلطنت کا اثر سمٹ کر محدود' اور افراد کا اثر پھیل کر غیر محدود ہو جاتا ہے' اس نظام حکومت میں بندرگاہ' محکمہ انہار' ریلوے' اسکول و کالج' غرض رفاہ عام کے تمام کام اشخاص کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں' خود حکومت ان کا انتظام نہیں کرتی' اور یہ روش لیٹن قوموں کی روش کے بالکل مخالف ہے' اس وقت افراد کی ذاتی حرکت کی نشوونما کا سب سے زیادہ روشن مظہر امریکہ ہے' کیونکہ انگلستان میں ۲۵ سال سے سلطنت آہستہ آہستہ اس کو روک رہی ہے' اس لئے اس میں اب بہت کچھ ضعف آگیا ہے۔

جن اخلاق کا اثر قوم کے نظام حکومت پر پڑتا ہے ان کو شورش' جمہوری نظام سلطنت استبداد پسند حکومت' غرض کوئی چیز نہ پیدا کرسکتی' نہ ان کے ذریعہ سے وہ فنا ہوسکتے' یہ بار بار کہا جاچکا ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک خاص طرز حکومت موزوں ہوتا ہے' اس کے سوا عقل کسی دوسرے نظام حکومت کو جائز نہیں رکھتی' ہم عنقریب بیان کریں گے کہ کسی قوم کو اس کے مزاج عقلی کے نتائج سے مفر نہیں ہوسکتا' ہوا جب ریگ کے ذروں کو اڑاتی ہے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے قانون جذب و کشش کی خلاف ورزی کی ہے' حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہوسکتا' اسی طرح دو ایک دن سے زیادہ کوئی قوم اپنے مزاج عقلی کی مخالفت نہیں کرسکتی' یہ ایک لغو خیال ہے کہ "قوموں کا انجام کار حکومت اور نظام حکومت کے ہاتھ میں ہے" اس کے عواقب و نتائج کا مرکز اس کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہے' اگر حکومت کسی قوم کو اس کے جذبات و خیالات کے مخالف تکلیف مالایطاق دینا چاہتی ہے' تو وہ اس کا جوا اپنے کندھے سے اتار کر پھینک دیتی ہے' ہر حکومت کا وجود قوم کے جذبات و خیالات کا آئینہ ہوتا ہے' اور اس لئے کسی نظام حکومت کو کلیتا" اچھا یا برا نہیں کہا جاسکتا' شاہ داہومی (۲) جس قوم پر حکومت کرتا تھا اس کے لحاظ سے اس کا طرز جہانبانی نہایت موزوں تھا' لیکن آج یورپ کا اعلیٰ نظام حکومت بھی اس ملک کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا' یہ ایک صداقت آمیز حقیقت ہے' لیکن بدقسمتی سے آج مدبران

سیاست اس سے بالکل ناواقف ہیں' اور اس لئے ان کا خیال ہے کہ حکومت ایک تجارتی مال ہے' جس کو ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے' اور جو نظام حکومت دارالسلطنت کا ہے' اسی اصول پر نو آبادیوں میں بھی حکومت کی جاسکتی ہے' لیکن یہ خیال اسی قدر غلط ہے جس قدر ایک شخص مچھلی کو اس غلط دلیل کی بنا پر ہوا میں زندہ رکھنا چاہتا ہے کہ "دنیا کے تمام جانور ہوا میں سانس لیتے ہیں"۔

قوموں کے مزاج عقلی کا یہ اختلاف ان کو مدت تک ایک نظام حکومت کے زیر اثر نہیں رہنے دیتا' یہی وجہ ہے کہ انگریز' آئرش' سلافی' ہنگرین' عرب' اور فرنچ قوموں نے سخت دشواریوں اور متصل شورشوں کے بعد ایک قانون کے آگے سر جھکایا اور اسی بنا پر جو سلطنتیں مختلف قوموں پر حکومت کرتی ہیں' وہ نہایت سرعت کے ساتھ فنا ہوجاتی ہیں' ہندوستان میں مغلوں اور انگریزوں نے بے شبہہ ایک طویل زمانے تک اس اصول کے خلاف حکومت کی ہے' لیکن اولاً تو اس کا سبب یہ ہے کہ خود یہاں کی مختلف قوموں میں اس شدت کے ساتھ منازعت و مخاصمت رہتی ہے کہ اجنبیوں کے خلاف ان میں قومی اتحاد نہیں پیدا ہوسکتا' دوسری وجہ یہ ہے کہ خود ان اجنبی سلطنتوں نے اپنی سیاسی روشن ضمیری سے ان قوموں کے اخلاق و عادات کا ادب و احترام کیا ہے' اور ان کو اپنے مذہب و قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے کی آزادی دی ہے۔

قوموں کے مزاج عقلی اور اس کے نتائج کے متعلق معلومات کا اس قدر کافی ذخیرہ ہے کہ اگر ان کا استقصاء کیا جائے تو متعدد جلدوں کی ضرورت ہوگی' اور آج تک تاریخ نگاری کی جو روش چلی آتی ہے' وہ دفعتاً بدل جائے گی' میرے نزدیک ان معلومات کو سیاست اور تربیت کا اصول زریں قرار دینا چاہئے' جن کی وجہ سے متعدد غلطیوں سے نجات ملے گی اور بہت سے انقلابات کا خاتمہ ہوجائے گا۔

حواشی

(۱) ایک روشن خیال شخص موسیو (ڈیبون وائٹ) فرماتے ہیں کہ فرنچ قوم کی روح

کا مابہ الامتیاز وصف یہ ہے کہ جب تک سلطنت ترغیب و تحریص نہ دلائے' وہ کسی تمدنی کام میں کامیابی نہیں حاصل کر سکتی۔

(۲) افریقہ کی ایک قدیم سلطنت کا نام جو اب فرانس کے قبضہ میں ہے۔

دوسری فصل

نظریات سابقہ کا انطباق' انقلابات ولایات متحدہ امریکہ

اور

امریکہ کی اسپینی جمہوریت پر

انگریزی قوم کے اخلاق' امریکن روح کیونکر پیدا ہوئی؟ حالات معاش کی وجہ سے جو انقلاب پیدا ہوا ہے اس کی مشکلات' پست درجہ کی قوموں کے فنا کرنے کا قطعی فیصلہ' حبشی اور چینی' باوجودیکہ دونوں کا نظام ایک ہے' لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ ولایات متحدہ ترقی پزیر اور جمہوریت اسپینہ روبہ تنزل ہے؟ اسپینی جمہوریت امریکہ میں جو خودمختاری پھیل گئی وہ قوم کے انحطاط کا لازمی نتیجہ تھا'

اوپر (ا) کے اجمالی اشارات سے ثابت ہوگیا ہوگا کہ ہر قوم کے نظام حکومت کا مبداء اس کی قومی روح ہے' اور وہ اس میں اگرچہ سطحی اور عارضی تغیرات پیدا کرسکتی ہے' مگر اس کی حقیقت کو نہیں بدل سکتی' اب ہم اس فصل میں واضح مثالوں سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ روح قوم کے مستقبل اور اس کے نتائج عمل پر کس قدر قابو رکھتی ہے؟ اور نظام حکومت اس کے مقابل میں کس قدر بے اثر چیز ہے' اس وقت میں مثال کے طور پر ایک ایسے ملک

(یعنی امریکہ) کو پیش کرتا ہوں جس میں ایک ہی قسم کی آب و ہوا اور ایک ہی قسم کے ماحول میں' یورپ کی دو متمدن' ذہین اور طباع قومیں پہلو بہ پہلو آباد ہیں' اور ان میں نظام اخلاق کے سوا کوئی چیز مابہ الامتیاز نہیں' امریکہ دو براعظموں سے مرکب ہے' جن کے درمیان ایک برزخ حائل ہے' دونوں کا رقبہ قریب قریب برابر ہے' اور دونوں کی سرزمین میں بھی کوئی فرق نہیں' ایک کو انگریزوں نے فتح کیا ہے اور اس میں اپنی نو آبادی قائم کی ہے اور دوسرے حصہ میں اسپینی قوم آباد ہے۔ دونوں کا نظام حکومت جمہوری ہے' اور چونکہ جنوبی حصہ کی جمہوریت نے ولایات متحدہ کے جمہوری نظام کو اپنی طرف منقل کرلیا ہے' اس لئے دونوں کی جمہوریت میں ہم رنگی پائی جاتی ہے۔ غرض قومیت کے سوا کسی حیثیت سے ان دونوں قوموں میں اختلاف و تباین نہیں ہوسکتا' اس لحاظ سے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس اختلاف قومی کا کیا اثر ہے؟

سب سے پہلے اجمالی طور پر ان سکن انگریزوں کی اخلاقی حالت کا تذکرہ ضروری ہے جو ولایات متحدہ آباد ہیں' کیونکہ تمام دنیا کی قوموں میں صرف یہی ایک ایسی قوم ہے جس کے اخلاق و عادات میں اتحاد' ہم رنگی اور ہمواری پائی جاتی ہے' اس لئے اس کے مزاج عقلی کی تحدید نہایت آسان ہے۔

اخلاقی حیثیت سے انگریزی قوم کے مزاج عقلی کا امتیازی وصف قوت ارادی ہے' غالباً" قدیم زمانہ میں رومن قوم کے سوا ایسا بے نظیر عزم' ایسی بلند ہمت' اس قدر ضبط نفس' اس قدر استقلال' اس قدر نشاط' اس قدر شدید مذہبی احساس' اس قدر قومی احترام اور اس قدر احساس فرائض (سنس آف ڈیوٹی) دنیا کی کسی قوم میں نہیں پایا جاتا' لیکن عقلی حیثیت سے اس قوم کے ان امتیازی اوصاف کو جو اسی قوم کے ساتھ مخصوص ہیں اور دوسری متمدن قوموں میں نہیں پائے جاتے آسانی کے ساتھ نہیں بیان کیا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ عملی حیثیت سے اس کے تصورات و خیالات نہایت پختہ اور صحیح ہیں' اور وہ محض وہمی باتوں میں پڑکر گمراہ نہیں ہوتی' اس کو دوسری عبارت میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ اس کا ذوق عقلی حقائق واقعیہ کو شدت کے

ساتھ محسوس کرتا ہے' اور نظریات کلیہ یعنی خیالی تھیوروں کا اس پر بہت کم اثر پڑتا ہے' عقلی دائرہ کی عدم وسعت اس کو کم درجہ کے مذہبی عقائد کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی' ان عام اوصاف کے ساتھ انگریزوں کا مستقبل اس قدر روشن ہے کہ گویا انھوں نے اپنی زندگی کی تمام منزلیں متعین کرلی ہیں' اور اب وہ اس کو دوسری بہتر زندگی سے بدلنا نہیں چاہتے۔ ہر انگریز اپنے وطن' اپنے خاندان' اور اپنے آقا کا حق شناس ہوتا ہے' اور مستقبل کی غیر متبدل توقعات نے اجنبی قوموں کو ان کی نگاہ میں سبک کردیا ہے' قدیم رومن قومیں اپنے زمانہ عروج میں برابرہ کو جس نگاہ کے ساتھ دیکھتی تھیں' ان انگریز قوموں کو' اور غیر قوموں کے اخلاق و عادات کو اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں' اس بنا پر وہ اجنبیوں کا قومی احترام نہیں کرتے' ہر انگریز مدبر غیر قوموں کے معاملے میں ان چیزوں کو بے تکلف استعمال کرسکتا ہے' جن کو اگر وہ اپنے ملک میں رائج کرتا تو ہر طرف سے اس پر اعتراضات کئے جاتے اگرچہ فلسفیانہ حیثیت سے یہ ایک اخلاقی کمزوری ہے' لیکن قومی ترقی کے لئے اس سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں اس لئے انگریزوں کی یہ سب سے بڑی طاقت ہے' اور خود انگریزی سپہ سالار ولسلی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے' جب بحرمانش (۲) میں ایک ایسے راستے کے بنانے کی تجویز پیش ہوئی جو براعظم یورپ میں سلسلہ اتصال قائم کردے تو انگریزوں نے اس کو منظور نہیں کیا' اس موقع پر لوگوں نے کس قدر سچ کہا کہ "چینیوں کی طرح انگریز بھی غیر قوم کے اثرات کو اپنے ملک میں پھیلانا پسند نہیں کرتے اوصاف مذکورہ بالا انگریزی قوم کے ہر طبقے میں پائے جاتے ہیں' اس لئے ان کا اثر انگریزی تمدن کی ہر شاخ پر پڑا ہے' جو شخص چند دنوں کے لئے بھی انگریزی ممالک کا سفر کرے گا' اس پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی' اس کو ایک معمولی سے معمولی مزدور کے گھر میں بھی ایک مستقل طرز معاشرت اور بے نیازانہ زندگی نظر آئے گی' اس کا گھر بے شبہہ نہایت تنگ ہوگا' لیکن وہ ہمسایوں کی کش مکش سے بالکل الگ تھلگ نظر آئے گا وہ دیکھے گا کہ ایک انگریز ریلوے اسٹیشن پر جہاں لوگ دوڑ دوڑ کر بھیڑ بکری کی طرح ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں ایک دیوار کی آڑ میں

جس پر اس لئے پہرہ پڑتا ہے' کہ لوگوں کو گاڑیوں کی ٹکر سے بچایا جائے چپ چاپ کھڑا رہتا ہے' اس کے سامنے انگریزی قوم کا عزم و استقلال ایک آزاد اور خود مختار زندگی رکھنے والے طالب علم کی طرح' ایک محنتی مزدور کے کاموں میں بھی نمایاں ہوگا' اس کو محسوس ہوگا کہ ہر انگریز پروفیسر تعلیم سے زیادہ تربیت اخلاق پر زور دیتا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی کل اخلاق ہی کے ذریعہ سے چلائی جاسکتی ہے' مختصر یہ کہ اگر وہ انگریزوں کی عام زندگی پر نظر ڈالے گا تو اس کو معلوم ہوجائے گا کہ دیہاتی اسپتالوں کی اصلاح' بندرگاہوں کی تعمیر' ریلوے کا قیام' غرض انگریزوں کے اکثر کام افراد کی قوت سے چلتے ہیں' ان میں حکومت کا کوئی حصہ شامل نہیں ہوتا' اس بنا پر اگر وہ ان حالات کا بغور مطالعہ کرے گا' تو اس کو تسلیم کرنا پڑے گا' کہ انگریزی قوم کو اگرچہ دوسری اجنبی قومیں' نہایت خشک' روکھی' اور اکھڑ قوم سمجھتی ہیں' لیکن دنیا میں صرف وہی ایک ایسی قوم ہے جس کو آزادی کے حقیقی معنوں میں آزاد کہا جاسکتا ہے' کیونکہ اس نے اپنے اوپر حکومت کرنے کا طریقہ معلوم کرلیا ہے' اس لئے اس نے حکومت کے دائرہ کو نہایت تنگ کردیا ہے' اگر انگریزی قوم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے' تو معلوم ہوگا کہ وہ دنیا کی سب سے پہلی قوم ہے' جس نے اپنے آپ کو کلیسا اور بادشاہ دونوں کی حکومت سے آزاد کرلیا ہے۔ پندرھویں صدی سے مقنن ذار سیکو انگریزی قانون اور رومن لا کا جو مقابلہ کررہا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں میں رومن لا کو خود مختار بادشاہوں نے وضع کیا ہے' اور اس کا مقصد افراد کی زندگی کو اپنے اوپر قربان کرلینا ہے' لیکن انگریزی قانون قوم کی مجموعی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے' اس لئے وہ قوم ہی کی حمایت کرتا ہے۔"

ایسی خوش اخلاق قوم جس جگہ ڈیرا ڈال دے گی' اس کا بول بولا ہوجائے گا' اور عظیم الشان حکومت قائم کرلے گی' لیکن اگر اس کی زیر اثر قوم بجائے خود ضعیف ہوگی تو وہ اس قوم سے اچھی طرح فائدہ نہ اٹھاسکے گی' چنانچہ شمالی امریکہ کے سرخ رنگ کے باشندے اس قوم کے فیض تربیت سے فائدہ نہ اٹھاسکے بلکہ فنا ہوگئے' لیکن اگر اس قوم کی تعداد زیادہ ہوئی' اور اس میں مفید

کاموں کے کرنے کا مادہ بھی ہوا جیسا کہ ہندوستانیوں کا حال ہے' تو وہ انگریزوں کی سخت فرماں بردار ہوجائے گی' اور زیادہ تر انہی کے فوائد کے لئے کام کرے گی'

انگریزی قوم نے اپنے مزاج عقلی کے ذریعہ سے جو ترقیاں کی ہیں' اگرچہ اس کے آثار ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ تاہم وہ جدید ممالک میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں' مثلاً" امریکہ ایک نیا ملک تھا' جس کے باشندے صرف چند وحشی تھے' وہاں زراعت کا نام و نشان تک نہ تھا' اس بنا پر اگر کوئی شخص وہاں آباد ہونے کی غرض سے جاتا تو اس کو اپنی ذات کے سوا کسی اور سے اعانت کی توقع نہیں ہوسکتی تھی' لیکن انگریزی قوم وہاں جاکر آباد ہوئی اور اس قدر ترقیاں کیں کہ دنیا کا کوئی فرد اس سے ناواقف نہیں' ابھی اس کی ترقی کا زمانہ ایک صدی سے زیادہ ممتد نہیں ہوا' لیکن وہ ترقی کے میدان میں دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں کے دوش بدوش کھڑی ہوسکتی ہے' اور بہت کم قومیں اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔چنانچہ جو لوگ جمہوریت امریکہ کے باشندوں کی رفتار ترقی کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں' ان کو موسیو روزیہ اور موسیو یورچہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے' جن سے معلوم ہوگا کہ انگریزی قوم میں اپنے اوپر حکومت کرنے' اعمال مہمہ کے لئے کمپنیاں بنانے' شہروں کے بسانے' مدرسوں اور بند گاہوں کے قائم کرنے' اور ریلوے لائنوں کے جال پھیلانے کا مادہ کس شدت کے ساتھ موجود ہے؟ امریکہ میں پولیس' اور پالیٹکس کے سوا سلطنت کا اثر تمام چیزوں میں اس قدر کم پایا جاتا ہے کہ ایک شخص کو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سرے سے کوئی سلطنت ہی قائم نہیں ہے' لیکن جو لوگ انگریزی قوم کے اخلاق سے معرا ہیں' وہ امریکہ میں بمشکل ترقی کرسکتے ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وہاں جاکر آباد ہوجاتے ہیں' وہ امریکہ کی قومیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتے سچ تو یہ ہے کہ امریکہ کی آب و ہوا میں انگریزوں کے سوا کوئی شخص زندگی بسر ہی نہیں کرسکتا اور جو لوگ انگریزوں کے اخلاقی اوصاف کے ساتھ متصف نہیں ان کو وہ سرزمین آہستہ آہستہ مٹادے گی کیونکہ وہاں کے جغرافیانہ طبعی حدود' دریا

اور پہاڑ کے بجائے عزم و استقلال ہیں' اس بنا پر نازک مزاج اٹالین تو وہاں بھوکوں مرجائے گا' اور آئرش اور حبشی ذلیل نوکروں کی زندگی بسر کریں گے۔

امریکہ کی عظیم الشان جمہوریت کو اگرچہ یقینی طور پر حریت زار کہا جاسکتا ہے' لیکن اس میں مساوات و مواخات کا وجود نہیں پایا جاتا مساوات و مواخات صرف لیٹن نثر و الفاظ ہیں' قانون ارتقاء کو اپنی کسی دفعہ کا جزو بنانا گوارا نہیں کرتا امریکہ میں نسل و خاندان کا اثر اس قدر شدید اور عالمگیر ہے کہ اس سے کسی فرد کو مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا' یہی وجہ ہے کہ وہاں کی قومیت اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے' جو لوگ ضعیف' متوسط الحال' اور ذاتی قابلیت سے محروم ہیں' امریکہ میں ان کا گزر نہیں ہوسکتا' اور اس کمزوری سے اس قسم کے افراد اور اس قسم کی قوموں کو یقیناً" فنا ہونا پڑے گا' چنانچہ اپوروج کو جب وہاں کی جغرافیانہ خصوصیات نے غیر مفید ثابت کیا تو ان میں کچھ لوگ بھوک سے مرگئے' اور کچھ لوگوں کو بندوق کی گولیوں نے اڑادیا' اور یہ جو چینی مزدور امریکہ کے خاص باشندوں کے کاموں میں خلل انداز ہورہے ہیں' عنقریب ان کا بھی یہی حشر ہوگا(۳) امریکہ سے ان کی جلاوطنی کا قانون پاس ہوچکا ہے' لیکن چونکہ اس کے لئے عظیم الشان مالی مصارف کی ضرورت تھی اس لئے اب تک نافذ نہ ہوسکا حالانکہ اس کے لئے معاوضہ عاجلانہ کی ضرورت ہے' تاہم معدنی صوبوں میں اس کی ابتداء ہوچکی ہے' اسی طرح قانوناً" غیر ملک کے غریب جلاوطن لوگوں کا سدباب کردیا گیا ہے' لیکن وہ حبشی جو امریکہ کی خانہ جنگی کا اصلی سبب ہوئے تھے' ان کا اب تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے' کیونکہ یہ لوگ اس قدر معمولی درجہ کے کام کرتے ہیں کہ خود ہر امریکن اس کو اپنے لئے ننگ و عار خیال کرتا ہے' قانونی حیثیت سے اگرچہ یہ لوگ بھی امریکہ کے باشندوں کے ساتھ مساویانہ حقوق رکھتے ہیں' لیکن عملی طور پر ان کے ساتھ جانوروں کی طرح برتاؤ کیا جاتا ہے' اور جب ان سے کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو تمام فوراً" ان کو سوسائٹی سے الگ کردیتی ہے' اس مسئلہ میں تمام امریکن قوم انھیں قدیم اصول کی پابند ہے جو لنش کے قانون نے قائم کئے تھے۔ ان میں پہلا اصول یہ ہے کہ جو لوگ جرائم

کا ارتکاب کرتے ہیں ان کو لوگ گولی ماردیتے ہیں' یا پھانسی پر لٹکا دیتے ہیں' چنانچہ گزشتہ سال میں جن لوگوں پر اس قانون کا نفاذ کیاگیا ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی' اس متمدن ملک کے دامن پر بے شبہ یہ ایک نہایت سیاہ داغ ہے' لیکن اس کی جگمگاہٹ' اس سیاہی کی متحمل ہوسکتی ہے' یورپ اور ولایات متحدہ میں جو فرق ہے' اس کی تشریح صرف اس مختصر فقرہ میں کی جاسکتی ہے کہ "یورپ اس قوم کے نتائج اعمال کا مظہر ہے جس میں افراد کی جگہ حکومت نے لے لی ہے' اور ولایات متحدہ ان افراد کی ہمت کا مرقع ہیں جو ہر سرکاری کش مکش سے آزاد ہیں" لیکن اس فرق مراتب کا منشاء اخلاق کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا' یہ بالکل یقینی ہے کہ امریکن ممالک میں اشتراکیت کو کوئی جگہ نہیں مل سکتی' کیونکہ اشتراکیت استبدادی حکومت کے رفتار ترقی کی آخری منزل ہے' اس بنا پر وہ صرف انہی فرسودہ سال قوموں میں نشوونما پاسکتی ہے جنھوں نے صدیوں تک ایک ایسے نظام حکومت میں زندگی بسر کی ہے' جس نے اپنے اوپر حکومت کرنے کا ملکہ ان سے سلب کرلیا ہے۔

اب امریکہ کہ اس حصے کو چھوڑ کر ہم کو اس کے دوسرے حصے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جس میں ایک ایسی قوم آباد ہے' جس کی ذہانت و طباعی میں اگرچہ کوئی شبہہ نہیں کیا جاسکتا' تاہم وہ ان اخلاقی اوصاف سے معراء ہے' جن کے نتائج کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے' قدرتی پیداوار کے لحاظ سے جنوبی امریکہ دنیا کا سب سے بڑا زرخیز ملک ہے' اس کا رقبہ یورپ کے رقبہ سے دوگنا ہے' اور اس کی آبادی یورپ کے دسویں حصہ کے برابر ہے' وہاں زمین کا مالک وہ شخص ہوتا ہے' جو اس کی کاشت کرتا ہے' اس لئے وہ ہر شخص کے لئے وقف عام ہے' باشندوں میں اسپینیوں کی تعداد غالب ہے' اس میں متعدد جمہوری ریاستیں مثلاً" ارجنٹائن' برازیل' چلی' پیپر وغیرہ قائم ہیں' اور ان میں ہر ایک ریاست نے ولایات متحدہ کے نظام و اختیار کیا ہے' اس لحاظ سے یہ تمام ریاستیں ایک ہی قانون کے زیر اثر ہیں' لیکن بااین ہمہ ان میں ہمیشہ ایک قومی طوائف الملوکی قائم رہتی ہے' جس کا اصلی سبب قومیت کا اختلاف اور ان اساسی اخلاق

کا نقدان ہے' جو ولایات متحدہ کے باشندوں میں پائے جاتے ہیں اس کی زمین جس قدر سر سبز ہے' اسی قدر اس کو ہر قسم کے نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں' افلاس اس پر چھا جاتا ہے' اور استبداد اس کو مار ڈالتا ہے۔

جو لوگ امریکہ کی اسپینی جمہوریت کے حالات تنزل سے پوری طور پر واقف ہونا چاہتے ہیں ان کو موسیوٹی شیلا کی کتاب پڑھنی چاہئے' جس میں بتایا گیا ہے کہ اس انحطاط کا سبب صرف اس قوم کا مزاج عقلی ہے' کیونکہ وہ عزم و ارادہ تمام ملکات فاضلہ سے معراء ہے' اور اسی اخیر شرف و مزیت سے بے بہرہ رہنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کا تنزل تمام یورپ میں ضرب المثل ہے' مصنف موصوف نے وہاں کے ایک اہم شہر یعنی یونیوس (۴) ایریس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "جس شخص میں رائی کے برابر زندہ احساس' اور ذرہ کے برابر بھی اخلاق موجود ہے' یہ شہر اس کی اقامت کے قابل نہیں"

اور جمہوریت ارجنٹائن کے متعلق جو تنزل میں اس سے بہت کم ہی لکھا ہے "جو شخص اس جمہوریت کے تجارتی معاملات پر نگاہ ڈالے گا' اس کے چہرے پر اس بدعہدی اور بے اعتباری کو دیکھ کر شرم کی ایک تہ چڑھ جائے گی جو ہر جگہ آفتاب کی طرح نظر آتی ہے"

اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ "ہر نظام حکومت کا مبداء قومیت ہے' اور ایک نظام حکومت دوسری قوم میں منتقل نہیں کیا جاسکتا" تو اس کی دلیل میں صرف امریکہ ہی کو پیش کیا جاسکتا ہے' ولایات متحدہ کے آزادانہ طرز حکومت نے پست درجہ کی قوموں میں منتقل ہو کر جو قالب اختیار کرلیا اس سے واقف ہونے کا دل میں شوق پیدا ہوتا ہے' موسیو شیلا امریکہ کی اسپینی جمہوریت کے متعلق فرماتے ہیں "وہ ان امراء کے ہاتھ میں ہے' جو زار روس بلکہ اس سے بھی زیادہ مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں' کیونکہ یورپ کی طرح ان کا محاسبہ و مراقبہ نہیں کیا جاتا' تمام عہدہ دار ان کے دست پرور ہیں رعایا جس کو چاہتی ہے آزادی کے ساتھ انتخاب کرتی ہے' لیکن اس کے انتخاب کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا' جمہوریت ارجنٹائن صرف نام ہی کی جمہوریت ہے ورنہ درحقیقت وہ شخصی

حکومت ہے، جس کو چند لوگوں نے سیاست کی منڈی بنالیا ہے"

برازیل اگرچہ اس تنزل سے محفوظ ہے، لیکن یہ شاہی حکومت کا احسان ہے، جس نے اس کو مطلق العنانی کی خواہشوں کے جنگل میں جانے نہیں دیا، لیکن چونکہ یہ نظام حکومت ایسی ضعیف الارادہ اور کم ہمت قوم کی حالت کے لحاظ سے کسی قدر زیادہ آزاد تھا، اس لئے دوسری مرتبہ اس کا ڈھانچہ بگڑ گیا اور اس کے ہاتھ تمام قوموں میں بھی طوائف الملوکی پھیل گئی اور مدبران سلطنت نہ چند سال میں رعایا کی تمام دولت تقسیم کرلی، پھر اس کے بعد فی صدی ساٹھ روپیہ کے حساب سے ٹیکس میں اضافہ کردیا

لیٹن قوموں کا یہ انحطاط صرف امریکہ کی سیاسی حالت ہی سے نمایاں نہیں ہوتا بلکہ تمدن کے کل عناصر میں یہی آثار پائے جاتے ہیں یقیناً" ایک دن اس بدبخت اور کس مپرس جمہوریت کا خاتمہ وحشت پر ہوگا، کیونکہ اس کی صنعت اور تجارت دونوں غیر قوموں یعنی انگریزوں، جرمنوں اور امریکنوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہیں، یہاں تک کہ فالیا ریزو ایک انگریزی شہر ہوگیا ہے، اگر غیر ملک کے باشندے نہ ہوتے تو چلی میں کیا دھرا تھا؟ اگر اس میں ان اجنبیوں کی آبادی نہ ہوتی تو اس میں تمدن کا وہ آب و ہوا رنگ نظر نہ آتا، جس کے لئے تمام یورپ اس کی طرف آمادہ سفر ہے، جمہوریت ارجنٹائن میں ۴۰ لاکھ سفید رنگ کے باشندے ہیں جن کی اصل اسپینوں سے ملتی ہے، لیکن ان میں ایک کے ہاتھ میں بھی کوئی اہم صنعت نہیں، بلکہ کل کی کل اجنبیوں کے دست تصرف میں ہے۔

لیٹن قوم کا یہ حیرت انگیز انحطاط، ایک ایسے ملک کے پہلو بہ پہلو جہاں انگریزی ترقی کے آثار نمایاں ہیں، رنج و غم کے جذبات کو قدرتی طور پر ابھار دیتا ہے، لیکن یہ ایک مشاہدہ ہے، اور ایسا مشاہدہ جس سے زیادہ صحیح طور پر کسی دوسرے طریقے سے نوامیس نفسیہ پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی

(۱) افسوس ہے کہ اس فصل میں بہت سے نامانوس ناموں کی تصحیح ہم نہ کرسکے

(۲) بلجیم کا ایک تجارتی شہر۔

(۳) امریکہ میں ایک قانون جاری تھا' جس کی رو سے اگر قوم کسی کالے آدمی کو مجرم سمجھتی تو خواہ وہ عدالت میں پیش کیا جاتا یا نہ کیا جاتا' عدالت اس کو سزا دیتی یا نہ دیتی' لیکن وہ خود اس کو پھانسی تک سزا دے سکتی تھی یہ قانون اگرچہ اب منسوخ ہو گیا ہے لیکن ولایات غربیہ' اور جنوبیہ میں جہاں امریکہ کی اصل قوم آباد نہیں اب تک جاری ہے۔

(۴) ریاست ارجنٹائن کا دارالحکومت۔

تیسری فصل

قومی روح کے تغیر و تبدل سے قوم کے اطوار زندگی بھی بدل جاتے ہیں

اجنبی قوموں کا اثر قوم کی روح اور قوم کے تمدن کو بدل دیتا ہے' روما کی مثال' روما کا تمدن برابرہ کی فوجی غارت گری سے برباد نہیں ہوا' بلکہ ان کے اختلاط و امتزاج سے اس پر زوال آیا' سلطنت روم کے زوال کا خیال بھی برابرہ کے دل میں نہیں آیا تھا' ان کی غارت گری نے فتح کی شکل اختیار نہیں کی' فرنک کے قدیم روساء نے ہمیشہ اپنے آپ کو سلطنت روم کا سرکاری ملازم سمجھا' انھوں نے روم کی عظمت کا ہمیشہ احترام کیا' اور اس کے قائم رہنے کی فکر میں مصروف رہے' بربر کے روساء نے گال قوم کے ملک یعنی فرانس میں شاہ روم کی سیادت سے ساتویں صدی میں سرکشی کرنا شروع کی۔ رومن تمدن کا انقلاب کلی اس بنا پر نہیں ہوا کہ اس کی بنیاد میں کسی قسم کا تزلزل واقع ہوگیا بلکہ اس بنا پر کہ ایک جدید قوم نے اس تمدن قدیم کی نقل و تقلید کی' ولایات متحدہ میں موجودہ دور کی غارت گریاں' ان غارت گریوں کی وجہ سے بہت سے اندرونی جھگڑوں کا مواد فراہم ہوتا ہے' اور الگ الگ مستقل حکومتوں میں ملک کی تقسیم ہوجاتی ہے' فرانس میں اجنبیوں کی غارت گری اور اس کے نتائج۔ گزشتہ مثالوں سے ثابت ہوا ہوگا کہ تمدن کا مبداء اصلی' نظام حکومت نہیں

بلکہ ہر قوم کا نظام اخلاق یعنی اس کی فطرت ہے' اسی طرح جہاں ہم نے تاریخی قوموں کی پیدائش پر بحث کی ہے' وہاں بتایا ہے کہ جب اجنبی قوموں کے ساتھ ان کا سلسلہ توالد و تناسل قائم ہوتا ہے تو ان میں ضعف کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں' اور جو قوم اجنبیوں کے میل جول سے الگ تھلگ رہی ہے' صرف اسی نے اپنے آپ کو اس اضمحلال طبعی سے بچایا ہے' اور اپنی اجتماعی قوت کو محفوظ رکھا ہے' چنانچہ ہندوستان میں قدیم آرین قوم' اور آج تمام نو آبادیوں میں انگریزوں نے اسی اصول پر عمل کرکے اپنی قومی خصوصیات کی محافظت کی ہے' صرف اجنبی قوم کے چند افراد کا وجود قومی روح کے بدلنے کے لئے کافی ہے' کیونکہ قوم اگرچہ خود ان افراد کے ذاتی اثر سے بچ سکتی ہے' لیکن وہ ان کی آئندہ نسل' ان کے تاریخی آثار' اور ان کے آباؤ اجداد کے کارناموں کے اثر سے کیونکر محفوظ رہ سکتی ہے؟

یہ ہمارے گزشتہ بیانات کا نتیجہ ہے' لیکن جب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ تمام تمدنی شاخیں صرف قومی روح سے نکلی ہیں' تو اس روح کے تغیر سے تمدن و تہذیب میں بھی تغیر کا پیدا ہونا لازمی ہے' زمانہ گزشتہ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں اور آئندہ زمانے میں مستقبل بھی اسی قسم کی مثالوں کو پیش کرے گا' چنانچہ اس کلیہ کی سب سے بہتر مثال روما کے تمدنی انقلاب میں ملتی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ انقلاب بربر کی غارت گری کا نتیجہ تھا' لیکن غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت روم کا زوال جنگی لوٹ مار کا نتیجہ نہیں' بلکہ مصالحت آمیز غارت گری کا نتیجہ ہے' صرف یہی نہیں کہ بربر نے تمدن روم کی بنیاد کو متزلزل کرنا نہیں چاہا' بلکہ انھوں نے اس کا احترام کیا' اور اپنے آپ کو اس قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی' چنانچہ انھوں نے رومیوں کی زبان کو سیکھنا چاہا اور ان کے نظام حکومت اور فنون لطیفہ کی محافظت کی اور اپنی سلطنت کے آخری زمانہ یعنی شاہ المیرو نیجین کے عہد تک اس موروثی تمدن کو محفوظ رکھا' چنانچہ شاہ شارلمان اعظم کے تمام کارناموں پر اسی تمدن کا رنگ چڑھا ہوا ہے' لیکن ہم کو یہ اتنا معلوم ہے کہ یہ ایک محال کام تھا' جس کو بربر انجام دینا چاہتے تھے' اسی بنا پر

جب صدیوں کے بعد بربر کی ایک نئی نسل پیدا ہوگئی تو طرز معاشرت کے اتحاد نے ان کی ایک جدید قوم پیدا کردی' اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے ایک جدید نظام حکومت اور جدید فنون لطیفہ بلکہ ایک جدید تمدن پیدا کردیا' یہ سچ ہے کہ یہ تمدن رومن تہذیب کے اثر سے بالکل آزاد نہ تھا' تاہم اس میں بھی شبہہ نہیں کہ رومن تمدن کے بقا و قیام کے لئے جو کوششیں کی گئی تھیں وہ بالکل ضائع گئیں' اور شورش اور علمی ترقی دونوں اس کے فنون لطیفہ اور نظام حکومت کا اعادہ نہ کرسکیں۔ اس بنا پر سلطنت روم پر بربر غارت گری کا آغاز اگرچہ پہلی صدی عیسوی سے ہوچکا تھا' اور آخرکار وہ لوگ اس کو نگل بھی گئے' تاہم درحقیقت انھوں نے رومن تمدن کو مردہ نہیں کیا' بلکہ اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی' اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ برابرہ نے رومیوں سے جنگ نہیں کی' بلکہ صرف ان کے ساتھ آہستہ آہستہ میل جول پیدا کرنا شروع کیا' اور اس طرح رومیوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی' تب بھی تاریخی روش میں کوئی تغیر نہ پیدا ہوگا' اور نتیجہ وہی ہوگا جو اوپر گزرچکا ہے' یعنی صرف یہ اختلاط اگر سلطنت روم کی بنیاد کو متزلزل نہ کردیتا تو کم از کم اس کی روح کو تو ضرور فنا کردیتا' اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ رومن تمدن میں دفعتاً" انقلاب نہیں پیدا ہوا' بلکہ صرف اجنبی قوموں کے ہاتھ میں پڑنے سے رفتہ رفتہ اس میں تغیر پیدا ہونے لگا' چنانچہ بربر غارت گری کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈالنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

علمائے آثار قدیمہ خصوصاً" فوسٹیل دی کولانج کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف بربر کی اس مصالحت آمیز غارت گری نے سلطنت روم کی بنیاد متزلزل کردی[2] اور اس فوجی غارت گری نے جس کی مدافعت رومی خود بربر سپاہیوں کے ذریعہ سے کرتے تھے' اس کے تمدن کو خفیف سی ٹھیس بھی نہیں لگائی' کیونکہ شاہان قدیم کے زمانے سے رومن فوج میں بربروں کی بھرتی ہونے لگی تھی' اور جس قدر روم کی دولت و ثروت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور لوگ عیش پرستی کی وجہ سے فوجی خدمت سے جان چراتے تھے' اسی قدر یہ روش

وسعت اختیار کرتی جاتی تھی' چنانچہ چند ہی صدیوں میں تمام فوجی مناصب اور سرکاری عہدے اجنبی قوموں سے بھر گئے' اور تمام فوجی نظام و زغوط' برجوندی' اور فرنک سے مرکب ہوگیا اور چونکہ تمام فوجی اور ملکی عہدے بربر کے ہاتھ میں آگئے تھے' اس لئے رفتہ رفتہ تمام صوبے خودمختار ہونے لگے یہ سب کچھ ہوا تاہم سلطنت کے نفوذ قوت کا یہ اثر تھا کہ بربر کسی قسم کے انقلاب پیدا کرنے کی جرات نہ کرسکے' یہاں تک کہ ان کا جو فرد خود روم کی حکومت کررہا تھا وہ بھی کسی قسم کا انقلاب نہ پیدا کرسکا چنانچہ ۱۴۷۶ میں جب ادوار شاہ ہیرول نے روما پر تسلط حاصل کرلیا' تو اس نے نہایت عجلت کے ساتھ شاہ قسطنطنیہ سے درخواست کی کہ اس کو ماپریس (سردار) کے خطاب کے ساتھ اٹلی کی حکومت کی اجازت دی جائے' اور ان کے تمام روساء میں سے کسی نے اس روش کی مخالفت نہیں کی بلکہ تمام صوبوں پر روم کے نام سے حکومت کرتے رہے۔ لیکن ملک میں کسی قسم کا تصرف کرنے یا نظام حکومت کے بدلنے کا خیال ایک دن بھی ان کے دل میں نہیں پیدا ہوا یہاں تک کہ گلو فیس اپنے آپ کو ہمیشہ ایک رومی عہدہ دار سمجھتا رہا' اور جب شاہ روم نے اس کو قنصل کا خطاب دیا تو وہ فخرو غرور کے نشہ میں چور ہوگیا' چنانچہ ۳۰ سال تک اس کے جانشینوں نے رومن شاہنشاہی قوانین کے مطابق حکومت کی' اور تمام لوگوں کو اس کے ادب و احترام پر آمادہ کیا' ساتویں صدی عیسوی تک یہی حالت قائم رہی' لیکن ان کے بعد بربر نے اس قدر جرات کی کہ گال میں سکے ڈھالے اور اس پر اپنی تصویر بنائی' حالانکہ اس زمانے میں سکوں پر صرف سلاطین روم کی تصویریں ہوتی تھیں' اسی زمانے میں بربر نے سلطنت روم کی سیادت سے انکار کیا' اس بنا پر جن مورخین نے اس سے دو سو برس پہلے سے فرانس کے تاریخی زمانے کی ابتداء کی ہے' اور موجودہ بادشاہوں میں دس بادشاہوں کا اضافہ کردیا ہے' انھوں نے سخت غلطی کی ہے' روم پر بربر غارت گری فتوحات کی شکل میں ظاہر نہیں ہوئی کیونکہ رعایا کو ان کی جائداد زبان اور قانون پر قائم رہنے دیاگیا' اس لئے قیاس غالب یہ ہے کہ سلطنت روم کا زوال اس تدریجی رفتار کے ساتھ ہوا کہ اس زمانے کے لوگوں کو

خبر بھی نہ ہونے پائی' ملک صدیوں سے متعدد صوبوں میں تقسیم ہوچکا تھا' جس پر گورنر شاہی لقب کے ساتھ حکمران تھے' لیکن ان گورنروں نے یہ خودمختارانہ حکومت نہایت تدریجی ترقی کے ساتھ حاصل کی تھی' اس بنا پر میرو فنجین کے زمانہ تک یہ لوگ نظام حکومت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ پیدا کرسکے' روم میں عام انقلاب کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب ایک جدید تاریخی قوم عالم وجود میں آئی اور قوانین فطرت کے مطابق اس کے ساتھ لازمی طور پر ایک تمدن جدید کی نشوونما بھی ہوئی۔

قوموں کی زندگی کا یہ ایک غیر متبدل قانون ہے' جس کے نئے نئے نتائج ہمیشہ ظاہر ہوتے رہتے ہیں' اس قانون کے پیش نظر رکھنے کے بعد ہم کو اس زمانے میں ایسی مصالحت آمیز غارت گریاں نظر آتی ہیں' جو اس غارت گری سے بہت کچھ مشابہ ہیں' جس نے تمدن روم کو بالکل بدل دیا تھا' آج تمدنی وسعت کی بنا پر یہ عام خیال پیدا ہوگیا ہے کہ بربر کا زمانہ گزرگیا اور انھوں نے وسط ایشیا اور افریقہ میں اقامت اختیار کرلی اس لئے ان کو کوئی قابل لحاظ قوم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ہم کو ان کا ڈر جو کچھ ہے صرف اقتصادی حیثیت سے ہے کہ وہ اس کے لئے ہم سے لڑتے بھڑتے رہتے ہیں' بے شبہ ہم بھی ان قدیم بربروں سے بحث نہیں کرتے لیکن گفتگو ان بربروں کے متعلق ہے' جن کو ہم اپنے آپ سے دور سمجھتے ہیں' حالانکہ وہ رومن شاہنشاہی کے بربروں سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہیں کیونکہ ان کی آبادی تمام متمدن قوموں کی نگاہ کے سامنے ہے' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارا تمدن نہایت کثیر الاجزاء شاخ در شاخ' اور گروہ در گروہ ہوگیا ہے' اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں' افراد کے درمیان بہت زیادہ فرق مراتب ہوگیا ہے' دوسری طرف ہر قوم میں ان غیر متمدن افراد کی کثرت ہوتی جاتی ہے' جو اس ترقی یافتہ تمدن کے متحمل نہیں ہوسکتے' یہ قومی ضعف روز بروز بڑھتا جاتا ہے' اس میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے' اور عنقریب اس غارت گری کا دور شروع ہونے والا ہے' ان جدید برابرہ نے تارک الوطن ہوکر ولایات متحدہ امریکہ کو لوٹنا شروع کردیا ہے' اور اس

عظیم الشان قوم کا تمدن ان کی وجہ سے معرض خطر میں ہے جب تارک الوطنی کا رواج کم تھا' اور تارک الوطن لوگ صرف انگریز تھے تو امریکہ کی زمین نہایت آسانی کے ساتھ ان کو جذب کرلیتی تھی' اور انگریزوں ہی کی تارک الوطنی نے امریکہ کی عظمت کا سنگ بنیاد رکھا' لیکن آج امریکہ میں غیر متمدن قوموں کا ایک سیلاب آگیا ہے' اور اس کی سرزمین ان کو جذب کرنا چاہتی ہے' اور نہ جذب کرسکتی '۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۸۹۰ء تک تقریباً" ساٹھ ملین (ایک ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے) تارک الوطن امریکہ میں داخل ہوئے' اور ان میں تقریباً" سب کے سب غیر متمدن قوموں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی قومیت بالکل مختلف تھی' چکاگو کی تمام آبادی میں اس وقت امریکن باشندوں کا چوتھائی حصہ بھی نہیں ہے' وہاں کی کل آبادی کی تعداد (۱۰۱۰۰۰۰) ہے جن میں (۴۰۰۰۰۰) جرمن (۲۲۰۰) آئرش (۵۰۰۰۰) پول (پولوتی) (۵۵۰۰۰) شیک وغیرہ ہیں' ان مہاجرین میں اور امریکہ کے خاص باشندوں میں کسی قسم کا میل جول نہیں ہے' یہاں تک کہ یہ لوگ اپنے جدید وطن امریکہ کی زبان بھی سیکھنا نہیں پسند کرتے' وہاں بہت سے ایسے تارک الوطن بھی ہیں جن کا پیشہ اس قدر قلیل النفع ہے کہ وہ اس پر قناعت نہیں کرسکتے' اس لئے ملک کے سب سے بڑے دشمن بن گئے ہیں' ریلوے لائنوں کے مزدوروں نے جب اسٹرائک کردی تھی تو ان لوگوں نے شہر میں آگ لگانے کا تہیہ کرلیا تھا' یہاں تک کہ حکومت کو مجبورا" توپ سے کام لینا پڑا' انہی لوگوں میں سے اس قبیح المنظر سوشیلزم کے سادھو اور منک پیدا ہوتے ہیں' جس نے بڑے بڑے ایوانوں کی دیواریں ہلادی ہیں اور جو یورپ میں بھی طبعی ضعف کی وجہ سے اپنا قدم جماتی جاتی ہے' لیکن ایک امریکن اس سے سخت نفرت رکھتا ہے۔

امریکہ کی عظیم الشان جمہوریت میں ان مذاہب مختلفہ کی بنا پر جو نزاع قائم ہوگئی ہے وہ عنقریب مختلف طرز معاشرت رکھنے والی قوموں کی عام جنگ بن جائے گی۔ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ امریکہ کے اصلی باشندوں' اور اجنبیوں میں جو جنگ عنقریب ہونے والی ہے' اس میں اجنبیوں کو فتح و ظفر حاصل نہ

ہوسکے گی' اور یہ معرکہ ایک ایسے مقبرہ کا سنگ بنیاد رکھے گا جو ماریوس کے ہاتھوں سامبر(ا) تباہی کا منظر دوبارہ دنیا کے پیش نظر کردے گا' لیکن اگر تارک الوطنی کا سلسلہ اسی وسعت کے ساتھ جاری رہا' اور جنگ میں تاخیر ہوئی تو ان اجنبیوں کا کامل استیصال نہ ہوسکے گا اور ولایات متحدہ کا بھی وہی حال ہوگا جو سلطنت روم کا ہوا یعنی اس کی تقسیم الگ الگ سلطنتوں میں ہوجائے گی' اور ان میں باہم متصل لڑائیاں قائم ہوتی رہیں گی جیسا کہ یورپ اور اسپینی امریکہ میں ہوتا رہتا ہے۔

صرف امریکہ ہی کو ان غارت گریوں کا خوف نہیں ہے' بلکہ یورپین قوموں میں فرنچ قوم کو بھی اس کا خطرہ ہے کیونکہ فرانس ایک زرخیز ملک ہے' اور اس کی آبادی میں اضافہ نہیں ہوتا' اس کے آس پاس کی قومیں نہایت مفلس ہیں اور ان کی مردم شماری میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے اس بنا پر فرانس کی طرف ان کی مہاجرت یقینی ہے' فرانس میں مزدوری کی شرح میں جو اضافہ ہوا ہے' وہ بھی اس کا موید ہے' کیونکہ فرانسیسی اس کے ذریعہ سے زرعی اور صنعتی کاموں میں اجنبیوں کے قبول کرنے پر تمام قوم کو مجبور کررہے ہیں' فرانس کے تارک الوطنوں کو جو فوائد حاصل ہوسکتے ہیں' وہ بالکل بدیہی ہیں' نہ ان کو فوجی خدمت پر مجبور کیا جاتا' اور نہ ان سے ٹکس لیا جاتا' اور اگر لیا بھی جاتا ہے تو چونکہ وہ لوگ مستقل قیام نہیں رکھتے' اور ان کے کام زیادہ محنت طلب نہیں ہیں' اور ان کو بہ نسبت اپنے ملکوں کے زیادہ اجرت دینا پڑتی ہے' اس لئے ان کو بہت کم ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے' فرانس میں صرف دولت ہی ان کو کھینچ نہیں لاتی' بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دوسرے ممالک ہمیشہ اس قسم کے قوانین وضع کرتے رہتے ہیں جن کی رو سے وہ ان ممالک کی طرف رخ نہیں کرسکتے۔

اجنبیوں کی اس غارت گری کا خطرہ اس لئے اور بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ نہایت پست طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں' اور صرف ذرائع معاش کی کمی سے ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑتا ہے' ہم انسانیت کے فطری اقتضائے محبت سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں' اس لیے ان کی تعداد روز بروز

بڑھتی جاتی ہے، آج سے چالیس سال پہلے ان کی تعداد (۴۰۰۰۰۰) سے کم تھی، لیکن اب یہ تعداد بڑھ کر (۱۲۰۰۰۰۰) تک پہنچ گئی ہے، ان کی نوعیت میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، اگر ہم صرف اٹالین قوم پر نظر ڈالیں تو مرسیلیا اٹالین نو آبادی معلوم ہوتی ہے، بلکہ اٹلی کی نو آبادیوں میں کوئی نو آبادی ایسی نہیں ہے، جس میں اٹالین باشندوں کی تعداد مرسیلیا کے اٹالین تارک الوطنوں کے برابر ہو اور اگر تارک الوطنی کی یہ رفتار اسی طرح جاری رہی تو عنقریب فرانس کی آبادی میں ایک ثلث جرمن اور ایک ثلث اٹالین عنصر نظر آئے گا، پھر ایسی حالت میں وہ فرانس کے قومی اتحاد بلکہ خود فرنچ قوم کی ہستی کا کیا حال ہوگا؟ جنگ کی بڑی سے بڑی مصیبت کے نتائج اس سے زیادہ آسان ہیں (۲) گزشتہ قوموں نے الہامی طور پر اجنبی قوموں سے نفرت کرنا سیکھا تھا، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ قوموں کی عزت صرف ملکی باشندوں کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے، ملک کی آبادی کی کثرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام تاریخی اور تمدنی مسائل کا سنگ بنیاد، قومی عناصر کا اتحاد ہے جس کے آگے ہر قسم کے اتحاد ہیچ ہیں

حواشی

(۱) برابرہ کا ایک فرقہ تھا جس نے دو سو برس قبل مسیح فرانس پر حملہ کیا تھا، اور اس کے حاکم ماریوس نے اس کو پامال کر دیا تھا۔

(۲) لیکن کوئی قوم اجنبیوں کی اس غارت گری کو روک نہیں سکتی، کیونکہ وہ اقتصادی مسائل کا نتیجہ ہے، اس لئے کسی قوم کو اس سے مفر نہیں ہو سکتا، البتہ بعض ذرائع سے اس کی نشوونما کو روکا جاسکتا ہے، مثلاً" ہر ۲۵ سالہ اجنبی باشندے کو دو برس کے لئے جبریہ فوجی خدمت پر مجبور کرنا چاہئے، اور جو شخص اس پر ایک سال کا اور اضافہ کرے، اس کو مالی معاوضہ دینا چاہئے، اسی طرح ہر اس شخص سے جو فرانس کی قومیت میں شامل ہو یا نہ ہو لیکن پچاس سال سے کم کا باشندہ ہو آمدنی یا اجرت کا چوتھائی حصہ ٹیکس میں لیا جاسکتا ہے، جو پریسڈنٹ اس قسم کا قانون پاس کردے وہ اس امر کا مستحق ہے کہ دائمی یادگار کے طور پر اس کا مجسمہ قائم کیا جائے۔

چوتھا باب

قوموں کے اوصاف نفسیہ میں کیونکر تغیر پیدا ہوتا ہے

پہلی فصل

قوموں کی زندگی پر اصول تمدن کا اثر

جن اصول پر تمدن کا دارومدار ہے ان کی تعداد نہایت کم ہے' ان اصول پر وجود اور عدم دونوں دیر میں طاری ہوتے ہیں' یہ اصول جب تک ملکہ راسخہ نہ بن جائیں' قوم کے اخلاق پر اثر نہیں کرتے اس حالت میں وہ اخلاق کا ایک جزو بن جاتے ہیں' ان اصول کے بدیر انقلاب پذیر ہونے کی وجہ سے ایک کافی مدت تک تمدن قائم رہتا ہے' یہ اصول کیونکر استحکام و ثبات حاصل کرتے ہیں' اس ثبات و استحکام میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہے' تاکید' اور مخفی قوت کا اثر پیغمبروں اور مذہبی پیشواؤں کا اثر' مختلف جماعتوں میں پھیل کر ان اصول کی صورت مسخ ہوجاتی ہے' جس وقت کوئی اصول ثبات اور رسوخ حاصل کرلیتا ہے اسی وقت تمدن کی تمام شاخوں میں اس کا اثر نمایاں ہوجاتا

ہے' ہر زمانے میں مطمح نظر کا متحد ہونا اور ایک ایسی متوسط اور متحد جماعت کا پیدا ہوجانا جس کے اعمال و عقائد میں یک جہتی ہو صرف ان اصول کے اتحاد کا نتیجہ ہوتا ہے' عادات اور رائے عام کا اثر' اس اثر کا وزن ابتلاء و امتحان کے زمانے میں جبکہ قدیم اصول کی قوت فنا ہوجاتی ہے' اور اس کی جگہ جدید اصول کی طاقت سے پر نہیں ہوتی ہلکا ہوجاتا ہے' صرف اتحاد ہی کے زمانے میں ہر رائے پر آسانی کے ساتھ بحث کی جاسکتی ہے' مذاہب کا دائمی وجود اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے' جب تک ان کے متعلق بحث و مناظرہ نہ کیا جائے' قومیں جب اپنے اصول اور مذاہب کو بدل دیتی ہیں تو مجبوراً" ان کو اپنا تمدن بھی بدلنا پڑتا ہے۔

اگرچہ ہر قوم کے نفسی اخلاق کی بنیاد نہایت مستحکم اور پائدار ہوتی ہے' تاہم جس طرح مرور زمانہ' اور قانون توارث کے تغیرات زمانی کے ساتھ خصائص جسمانی میں تغیر و تبدل ہوجاتا ہے' اسی طرح ان اخلاق میں بھی تغیر و تبدل کی صلاحیت موجود ہے' اور نظام اخلاق کا یہی تغیر تمدنی انقلاب کا سب سے بڑا سبب ہے۔

ان نفسی تغیرات کے متعدد اسباب ہیں مثلاً" (۱) ضروریات زندگی (۲) آب و ہوا اور جغرافیانہ حالات کا اثر (۳) علوم و فنون' صنعت و حرفت' تعلیم و تربیت اور عقائد و مذاہب وغیرہ کی ترقی' اس سے پہلے ہم نے ایک کتاب میں ان تمام موثرات پر استقصاء کے ساتھ بحث کی ہے' اس لئے اس کتاب میں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اس فصل اور اس کے مابعد کی فصل میں صرف چند مخصوص موثرات کے اثر اور اس کے علل و اسباب پر بحث کرنا کافی ہے۔

قوموں کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمدن کی ترقی کا تمام تر دار مدار صرف چند اصول پر تھا' اور اگر ان قوموں کی تاریخ میں صرف ان اصول سے بحث کی جاتی تو وہ اس قدر طویل نہ ہوتی' کیونکہ ان اصول کی وجہ سے جو تمدن صدیوں میں پیدا ہوتا ہے' اور جس کے بہترین اجزاء یعنی علوم۔ فنون لطیفہ' اخلاق و عادات اور فلسفہ کی بنیاد صرف ایک یا دو اساسی

اصول پر قائم ہوتی ہے' وہ اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ تمدن خیال کیا جاتا ہے۔

قومی روح پر ان اصول کا حقیقی اثر اس وقت تک نہیں ہوتا' جب تک بتدریج ان کا خمیر پختہ نہ ہوجائے اور عالم عقلی کی بلندی سے اتر کر وہ انسان کے غیر شاعرانہ مرکز عمل میں نہ آجائے' کیونکہ اس وقت وہ نظام اخلاق کا ایک جزو بن جاتے ہیں' اور قوم کی زندگی پر ان کا اثر پڑتا ہے' اس طریقہ پر جب ان اصول کا خمیر تیار ہوجاتا ہے' تو چونکہ وہ عقل کی حکومت سے آزاد ہوجاتے ہیں' اس لئے شدت کے ساتھ ان کا اثر پڑتا ہے' ہم کو علانیہ نظر آتا ہے کہ جس دل پر کسی مذہبی یا غیر مذہبی اصول کے اثر کا استیلاء ہوجاتا ہے' اس کا یقین عقل سے بالکل متاثر نہیں ہوتا' بلکہ دوسرے اصول کو کسی نہ کسی طرح توڑ مروڑ کر اپنے مسلمہ اصول کے ساتھ ضم کرلیتا ہے۔

اس مسئلہ کے ثابت ہوجانے کے بعد کہ "جب تک اصول عالم شعور سے اتر کر غیر شاعرانہ دنیا میں نہ آجائیں قومی زندگی پر ان کا اثر نہیں پڑتا" بہت سے عقدے حل ہوجاتے ہیں' ان کے بدیر تغیر پذیر ہونے کا سبب معلوم ہوجاتا ہے' یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ جن اصول پر تمدن کا دارمدار ہے ان کی تعداد نہایت کم ہوتی ہے' یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ ان میں ایک طویل زمانے کے بعد انقلاب پیدا ہوسکتا ہے' اور درحقیقت یہ نہایت مسرت کی بات ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمدن ایک مدت تک زندہ نہ رہتا' اسی طرح یہ بھی نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ نئے اصول میں ثبات و رسوخ کی قابلیت موجود ہوتی ہے' کیونکہ اگر صرف قدیم اصول ہمیشہ قائم رہتے' تو دنیا میں تمدن کو کبھی ترقی نہ ہوتی' لیکن چونکہ یہ قدیم اصول بہت دنوں کے بعد تغیرات کو قبول کرتے ہیں اس لئے جس طرح جدید اصول کئی نسلوں میں جاکر فنا ہوتے ہیں' اسی طرح کئی پشتوں کے گزرنے پر ان کا اثر نمایاں ہوتا ہے' لیکن دنیا کی سب سے زیادہ متمدن قوم وہ ہے جس کے اساسی اصول کے فنا و بقاء کی مدت میں اتحاد ہو' یعنی جتنے دنوں تک وہ قائم رہے ہیں' اتنے ہی دنوں میں وہ فنا بھی ہوں' لیکن جن قوموں کو خوش قسمتی کا یہ موقع نہیں ملا وہ فنا ہوگئیں اور تاریخ میں صرف ان کا

نام ہی نام باقی ہے۔

اس بنا پر قوموں کی تاریخ میں صرف اصول کی کثرت، اور ان کے ظہور کی قلیل مدت کا لحاظ نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس ان اصول کی قلت، ان کے بدیر تغیر پذیری، اور ان کے شدید اثر پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیے، بہرحال تمدن کو صرف چند اساسی اصول نے پیدا کیا ہے۔ انہی کے بقاء کے ساتھ وہ قائم رہتا ہے، اور انہی کے بدلنے سے بدل جاتا ہے، قرون وسطی کی زندگی صرف دو اصول پر قائم تھی، یعنی مذہب اور امراء کی سیادت، اس زمانے کے فنون لطیفہ، لٹریچر، غرض عام قومی زندگی کا وجود انہی دو ستونوں پر قائم تھا، اس کے چند دنوں کے بعد جب ایک نئے دور کا آغاز ہوا تو ان میں کس قدر تغیر پیدا ہوا لیکن جب یورپ کے دماغ پر یونانی دور جدید نے اثر ڈالنا شروع کیا تو فنون لطیفہ، فلسفہ، انشاء پردازی، اور لٹریچر، غرض عام قومی زندگی میں انقلاب پیدا ہونے لگا، اس کے بعد سنن قدیمہ کی قوت بالکل فنا ہوگئی، اور نقل کی جگہ عقل نے لے لی ہے، اب تمدن نے ایک نیا قالب اختیار کیا، اور مذہب کے تمام ارکان متزلزل ہوگئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس نظام اجتماعی کی بنیاد مذہبی اصول پر قائم تھی، اس کے منہدم ہونے کا بھی خوف پیدا ہونے لگا۔

لیکن صرف یہی ایک مثال کافی نہیں، ہم کو متعدد مثالوں سے ثابت کرنا چاہیے کہ خیالات و افکار کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟ کیونکر ثبات و رسوخ اختیار کرتے ہیں؟ کیونکر ان میں تغیر و زوال آتا ہے؟ اگر ہم کو جزئیات کے استقصاء کا موقع ملتا تو ہم بتاتے کہ تمدن کے تمام عناصر مثلاً" فلسفہ، مذہب فنون لطیفہ اور لٹریچر وغیرہ کی بنیاد صرف چند اساسی اصول پر قائم ہے، جو بہ تدریج نشوونما پاتی ہیں، خود علوم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں، چنانچہ علم طبعی صرف اس اصول پر قائم ہے کہ "قوت کبھی فنا نہیں ہوتی"۔

یہ اصول اگرچہ روشن دماغ لوگوں کی تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں، تاہم ان کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے نہایت مشکل اور نہایت تدریجی طور پر رسوخ و استحکام حاصل کیا ہے، اس زمانے میں اگرچہ ہر چیز نہایت سرعت کے

ساتھ ترقی کرتی ہے، اور اہل نظر کی تحقیقات ذاتی منافع اور خواہشات نفسانی سے متاثر نہیں ہوتی، تاہم اب بھی ایک بنیادی علمی اصول کے استحکام و وضاحت کے لئے ۲۵ سال کی مدت درکار ہوتی ہے، دوران خون کا اصول بذات خود نہایت واضح تھا اور اس کے متعلق بہت کم اختلاف ہوا، لیکن اس سے کم مدت میں وہ بھی ثابت نہ ہوسکا۔

تمام اصول کی تولید و ظہور بالکل یکساں طور پر ہوتی ہے، اس میں علمی اصول فلسفیانہ اصول، فنون لطیفہ کے اصول اور لٹریچر اور انشاء پردازی کے اصول میں باہم کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا، اول اول ایک مختصر گروہ جو ان اصول کی منادی کرتا ہے، ان کا پابند ہوتا ہے، اس کے بعد ان پر وہ لوگ عمل کرتے ہیں، جو اپنی قوت یقین، اور اقتدار سے قوم پر اثر رکھتے ہیں، ان لوگوں کا اثر خطبہ و تقریر کی بہ نسبت، تعلیم و تلقین کے ذریعہ سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ قوت بیانیہ میں حقیقی تشفی کا عنصر نہیں ہوتا، مخاطب متکلم کی اطاعت یا تو اس بنا پر کرتا ہے کہ متکلم کے نفوذ و قوت کا اس کو اعتراف ہے، یا خود متکلم مخاطب کے مذاق کے مطابق خطاب کرتا ہے، لیکن اگر وہ صرف عقل کو اپنا مخاطب بنائے تو اس کا کچھ بھی اثر نہیں پڑسکتا بالخصوص جماعت تو صرف متواتر تاکیدوں ہی سے متاثر ہوتی ہے، اور تاکید کی قوت تاکید کرنے والے کے ذاتی اثر پر موقوف ہے۔

ان اصول کی منادی کرنے والے جب اپنے قرب و جوار کے لوگوں کو متاثر کرلیتے ہیں، تو انھیں میں سے اور لوگ ان اصول کے اعلان کرنے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں، اب ان جدید اصول پر بحث مباحثہ شروع ہوجاتا ہے، بالخصوص ابتدائی حالت میں چونکہ یہ اصول متعدد قائم و ثابت چیزوں سے ٹکراتے ہیں، اس لئے ان کا عام طور پر معارضہ کیا جاتا ہے، لیکن اس سے ان منادی کرنے والوں کا جوش ایمان اور ترقی کرجاتا ہے، اور وہ اپنے اصول کی مدافعت نہایت عزم و استقلال کے ساتھ کرتے ہیں، صرف اس لئے نہیں کہ وہ ان اصول کی صداقت و حقانیت کا اعتقاد رکھتے ہیں، کیونکہ وہ لوگ خود بھی صحیح طور پر ان

کی صداقت کا علم نہیں رکھتے' بلکہ صرف اس لئے انھوں .... نے ان اصول کو اختیار کرلیا ہے اور ان کی منادی کررہے ہیں' اس وقت دونوں فریق میں سخت کش مکش پیدا ہوتی ہے' لیکن اس تصادم تجاذب کی علت صرف یہ ہوتی ہے کہ منادی کرنے والے باوجود ان تمام مزاحمتوں کے ان کو قبول کرتے ہیں' اور دوسرا اگر وہ اسی شدت کے ساتھ ان کا انکار کرتا ہے' اس حالت میں اگرچہ ایک فریق کو شدت کے ساتھ ان کا انکار ہوتا ہے' اور دوسرا گروہ متواتر تاکیدوں کے ساتھ ان کو منوانا چاہتا ہے' لیکن دلائل عقلیہ اس کش مکش سے بالکل علیحدہ رہتے ہیں' کیونکہ زیادہ تر اصول کے اعتراف و انکار کا تعلق احساس کے ساتھ ہوتا ہے' اور وہ دلیل سے بہت کم متاثر ہوتا ہے یہ جنگ جس قدر شدت اختیار کرتی جاتی ہے' ان اصول کو آہستہ آہستہ نشوونما ہوتی جاتی ہے' اور جو اصول پہلے سے ثابت و قائم تھے' ان کو وہ اپنے اندر جذب کرتے جاتے ہیں' کیونکہ ان کا شباب استقلال کا مقتضی ہوتا ہے' اور وہ قدیم اصول کا معارضہ اور مقابلہ کرنا چاہتے ہیں' اس تدریجی نشوونما کے چند ہی دنوں کے بعد یہ اصول اپنے حامیوں اور مددگاروں سے بے نیاز ہوجاتے ہیں' اور صرف نقل و تقلید کے ذریعہ سے عام طور پر پھیل جاتے ہیں' کیونکہ علوم جدیدہ کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے' کہ انسان کے ابوالاباء بندروں کی طرح خود انسانوں میں بھی نقل و حکایت کا مادہ شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

جب ان اصول کا دور نشر و اشاعت اس حد تک پہنچ جاتا ہے' کہ صرف سریان خیال یعنی نقل و تقلید کے ذریعہ سے وہ پھیلنے لگتے ہیں' تو ان کی کامیابی کا زمانہ شروع ہوجاتا ہے' رائے عام جن اصول کو جس قدر سرعت کے ساتھ قبول کرلیتی ہے' اسی قدر ان میں مخفی اور موثر طاقت زیادہ ہوتی ہے' یہی طاقت ان کو رفتہ رفتہ دماغ کی طرف لے جاتی ہے' اس میں ان کو مرتکز کردیتی ہے' اور اس میں ان کا قابل اطمینان ملکہ پیدا کردیتی ہے' اور وہ خاک کے ذروں کی طرح تمام خیالات' بلکہ اس زمانے کے تمام اعمال میں سرایت کرجاتے ہیں' اور موروثی عادات کا ایک جزو بن جاتے ہیں' اور مدتوں ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔

جن اصول پر تمدن کی بنیاد قائم ہوتی ہے' ان میں بعض صرف اعلیٰ طبقوں کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں مثلاً" جن اصول پر فنون لطیفہ اور فلسفہ کا دارمدار ہے' ان کو عوام سے کوئی تعلق نہیں' لیکن ان میں بعض اصول کی ہمہ گیری پست درجہ کے لوگوں کو بھی شامل ہوجاتی ہے' بالخصوص مذہب اور پالیٹکس کا تعلق تو زیادہ تر عوام ہے کے ساتھ ہوتا ہے' لیکن اس حالت میں ان اصول کی صورت بالکل مسخ ہوجاتی ہے' اور جب وہ ان سادہ لوح لوگوں کے قلوب میں مرتکز ہوجاتے ہیں' جو بغیر بحث و مباحثہ کے ان کو قبول کرلیتے ہیں' تو پہاڑ کی طرح اٹل ہوجاتے ہیں' اور سیلاب کی طرح پھوٹ بہتے ہیں' چنانچہ ہر قوم میں اس قسم کے لاکھوں آدمی مل سکتے ہیں' جنھوں نے اپنے اصول راسخہ کے لئے اپنی جانیں بے دریغ قربان کردی ہیں' یہی وہ عالم ہے جس میں وہ عظیم الشان واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں' جو تاریخ میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیتے ہیں' لیکن اس انقلاب کی سرخیل' صرف عوام کی جماعت ہوتی ہے' دنیا میں آج تک انشاء پرداز صناع' اور فلاسفہ کا گروہ نہ کسی عالمگیر مذہب کا علمبردار ہوا' نہ ان سلطنتوں کی بنیاد ڈالی جو کرہ ارض کے اس سرے سے اس سرے تک پھیل گئیں نہ اس نے وہ مذہبی اور سیاسی شورشیں برپا کیں جنھوں نے یورپ کی کایا پلٹ دی بلکہ ان انقلابات کے بانی صرف وہ ان پڑھ لوگ ہوئے' جنھوں نے ان اصول کے اذعان و اعتقاد اور ان کی حمایت کے مقابل میں اپنی جانوں کو متاع حقیر خیال کیا' اسی گروہ کے بل پر بادیہ نشینان عرب نے یونان اور روم کے پرخچے اڑادیے' اور دنیا میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کرلی' جو تاریخ میں یادگار ہے' اور یہی عملی گروہ شورش فرانس کے زمانے میں تنہا تمام یورپ کے مقابل میں کھڑا ہوگیا' کسی عقیدہ کی قوت و نفوذ کو صرف وہی عقیدہ ضعیف کرسکتا ہے' جو قوت و نفوذ میں اس کے برابر ہو' اس بنا پر ایمان کا دشمن صرف ایمان ہی ہوسکتا ہے' اور جو مادی قوت عقیدہ کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے وہ جب تک ضعیف احساس' اور کمزور عقیدہ کی پابند ہے اس وقت تک اس کے مقابل میں عقیدہ ہی کو فتح حاصل ہوگی لیکن اگر کوئی عقیدہ ایسے عقیدہ کے ساتھ

ٹکرائے جس کی قوت اس کے برابر ہے' تو جنگ مساویانہ حالت کے ساتھ قائم رہے گی' اور فتح و ظفر کا فیصلہ ان خارجی حالات پر معلق رہے گا' جو ان میں فریق غالب کو محیط ہیں' ان حالات میں قوت اخلاق' اطاعت کیشی' اور حسن نظام کو خاص طور ہر اہمیت حاصل ہے' اگر ہم عرب کی ابتدائی فتوحات کی تاریخ کا مطالعہ کریں (اور ابتدائی فتوحات عادتاً" زیادہ مشکل اور اہم ہوتی ہیں) تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جن دشمنوں سے ان کا مقابلہ ہوا ان کے فوجی نظام کی بنیاد اگرچہ نہایت مستحکم تھی لیکن ان کے نظام اخلاق میں سخت ضعف آگیا تھا' چنانچہ اول اول جب عربوں کی فوج نے ملک شام کی طرف پیش قدمی کی تو ان کا مقابلہ بیزنٹائن فوج سے ہوا جو صرف ان کرایہ دار مزدوروں سے مرتب کی گئی تھی جو کسی مقصد کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ نہ تھے' لیکن عربوں کے جوش ایمان نے ان کی قلیل جماعت کی قوت میں دس گنا اضافہ کردیا تھا اس لئے ایک ایسی فوج کے درہم برہم کرنے میں جو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جنگ نہیں کرتی تھی' ان کو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اسی طرح یونان کا ایک مختصر گروہ تمدن کے عشق میں متوالا ہوکر اٹھا' اور (زرکیس اعظم) کی فوجوں کے پرے کو الٹ دیا' لیکن اگر اس کے چند ہی صدی پہلے وہ لوگ' رومانی فوج سے دست و گریبان ہوئے تھے تو نتیجہ بالکل برعکس ہوتا' ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اگر اخلاقی حیثیت سے دو مساویانہ قوتوں میں تصادم ہوتو اسی کو فتح حاصل ہوگی' جس کا نظام مستحکم اصول پر قائم ہے یہی وجہ ہے کہ فرانس میں اہل عہد کا لشکر قدان کی فوج پر غالب آگیا' کیونکہ اگرچہ دونوں فوجیں قوت اعتقاد میں مساوی تھیں' لیکن پہلی فوج کا نظام نہایت عمدہ تھا۔

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح ہمیشہ ایمان داروں ہی کی ہوتی ہے' اس میں مذہب اور سیاست کی تفریق نہیں' بلکہ قوت اعتقاد کا نتیجہ دونوں جگہ یکساں طور پر ظہور پزیر ہوتا ہے۔ سوشلزم کی بنیاد اگرچہ نہایت بدترین اصول پر قائم ہے' لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ مستقبل صرف ان کے ہاتھ میں رہے گا' تو اس کی صرف وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں سوشلسٹ فرقہ کے سوا کسی

گروہ کا عقیدہ پختہ اور صحیح نہیں ہے' چنانچہ اس زمانے میں جس گروہ کے ہاتھ میں عنان حکومت ہے' وہ اپنی قوت یقین کو اس بے دردی کے ساتھ ضائع کرچکا ہے' کہ خود ان برابرہ کے سیلاب کو بھی نہیں روک سکتا جو ہر طرف سے امنڈ کر اس کا محاصرہ کرنا چاہتا ہے۔

جب یہ اصول' تغیر و تبدل' جنگ و جدل' اور نشر و اشاعت کے مختلف دوروں سے گزر چکتے ہیں' ان کی آخری صورت قائم ہوچکتی ہے' اور تمام قوم کی روح میں سرایت کرچکتے ہیں' تو وہ ایک مسلمہ عقیدہ اور ناقابل انکار حقیقت بن جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ان عقائد عامہ کے ساتھ مدغم ہوجاتے ہیں' جن پر قومی زندگی کی بنیاد قائم ہوتی ہے' اور ان کی تعمیم' ان کو نہایت موثر بنادیتی ہے' تاریخی حیثیت سے اگسٹس اورلوئیس چہاردہم کے زمانے میں ان اصول کا عمل تولید مکمل ہوچکا تھا' ان کی آخری صورت قائم ہوچکی تھی' بحث و مباحثہ کا دروازہ بند ہوچکا تھا اور وہ تمام قوم کے خیالات و افکار پر چھاگئے تھے۔ یہ اصول اسی درجہ کو پہنچ کر روشنی کے منارے کا قالب اختیار کرلیتے ہیں اور جو چیز ان کے سامنے پڑتی ہے' ان کی چمک سے جگمگا اٹھتی ہیں۔

جب کوئی نیا اصول قائم ہوتا ہے' تو تمدن کی تمام چھوٹی بڑی شاخوں سے اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور نمایاں ہوتا ہے' لیکن اس کا پورا اثر اس وقت ظاہر ہوتا ہے' جب وہ تمام قوم کی روح میں سرایت کرجاتا ہے' اس کی ترتیب اس طرح شروع ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے ان بلند خیال لوگوں کے دماغ سے جنھوں نے اس کو پیدا کیا ہے' اتر کر اس کے نیچے کے طبقہ میں نمایاں ہوتا ہے' پھر قالب بدلتا ہوا اس سے بھی کم درجہ کے لوگوں پر اثر کرتا ہے' یہاں تک کہ رفتہ رفتہ تمام قوم پر چھا جاتا ہے' اب اس کی کامیابی کا دور ختم ہوجاتا ہے' اور اس حالت میں اس کو نہایت مختصر الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے' یہاں تک کہ بعض اوقات صرف ایک لفظ میں اس کی تشریح کی جاسکتی ہے' لیکن یہ لفظ اس قدر موثر ہوتا ہے کہ دلوں کو دفعتاً ہلا دیتا ہے' قرون وسطی میں اس قسم کے الفاظ کی مثال کے لئے "جنت" اور "دوزخ" سے بہتر لفظ نہیں مل سکتا' یہ

دونوں الفاظ اگرچہ نہایت مختصر تھے' تاہم ان میں اس قیامت کا اثر تھا' کہ ہر چیز کو متاثر کرلیتے تھے' اور سادہ دل لوگوں کے سامنے ہر چیز کی حقیقت کو واضح کردیتے تھے' مزدوری پیشہ جماعت کے لئے اس زمانہ میں سوشلزم کا لفظ بھی اسی قسم کا عجیب و غریب اثر رکھتا ہے' وہ ہر جماعت کے سامنے مختلف مناظر کو پیش کردیتا ہے' لیکن اس تاثیر کا راز صرف ان کی سادہ لوحی میں مضمر ہے' وہ ایک فرنچ فلسفی کے سامنے جنت کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے' جس میں تمام لوگ مساویانہ طور پر حکومت کے زیر سایہ سعادت کاملہ سے متمتع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں' وہ ایک جرمن مزدور کے سامنے شراب کی بھٹی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے' جس سے متصل دھواں اٹھتا ہے اور جس کے دروازے پر حکام ہر آنے والے کے خیر مقدم میں سور کے گوشت کی قاب' نمکین چقندر اور بیر کی بوتلیں پیش کرتے ہیں' لیکن یہ ہدایتا" معلوم ہے کہ یہ لوگ دولت کی مقدار اور ان حصہ داروں کی تعداد سے بالکل ناواقف ہیں جن پر وہ مساویانہ حیثیت سے تقسیم کی جائے گی' لیکن یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں' اصول کے استحکام و ثبات کا اصلی کمال یہی ہے کہ وہ ایک عام اور مجمل صورت میں مرتکزنی النفس ہوجاتے ہیں' اور بحث و مباحثہ و شکوک و اعتراضات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

کوئی اصول جب آہستہ آہستہ اس قدر ثبات و استحکام حاصل کرلیتا ہے کہ ایک مسلمہ عقیدہ بن جاتا ہے' تو وہ مدتوں تک کامیاب حالت میں قائم رہتا ہے' اور اس کے متزلزل کرنے کے لئے جو دلائل قائم کئے جاتے ہیں' وہ بالکل ناکامیاب ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اصول قدیم کی طرح اس اصول جدید پر بھی کسی نہ کسی پیرے کے آثار طاری ہوجاتے ہیں' لیکن جب تک اس پر تغیر و تبدل کے بہت سے دور نہ گزر جائیں' اس کے بڑھاپے کا زمانہ نہیں آتا اور یہ تغیرات متعدد نسلوں کے بعد ظہور پزیر ہوتے ہیں' تاہم اس حالت فرسودگی میں بھی وہ بالکل بے اثر نہیں ہوتا جس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ قدیم موروثی اصول کے ساتھ مدغم ہوکر ایک مدت تک زندہ رہ چکا ہے' اور اس کے مقابل میں تمام قوم نے ان قدیم اصول کے احترام کو قائم رکھا ہے' اس بنا پر اگرچہ ہر

قدیم اصول کا نام بدل جاتا ہے' اور دلوں کے اندر سے اس کی آواز بازگشت نہیں آتی' تاہم قلوب پر ان کا اثر قائم رہتا ہے۔ اسی طرح ہر قدیم رائے' ہر قدیم عقیدہ' اور ہر قدیم عادت ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی نکتہ چینی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس قسم کی خطرناک بحث کبھی نہ چھیڑی جائے اور یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہر شخص خود اس قسم کے مباحث سے الگ رہنا چاہتا ہے' کیونکہ نقد و بحث کا ملکہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے' اور لوگ عموماً" تقلید کے غلام ہوتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا ان اصول کو صرف ان کی اشاعت یا تعلیم و تربیت کی بنا پر قبول کرلیتی ہے' اور اسی بنا پر ہر قوم اور ہر زمانے کی غالب تعداد میں ایک ہی قسم کے خیالات و افکار مشترک طور پر پائے جاتے ہیں' اور اسی اشتراک نے ان میں اس قدر مشابہت و ہم رنگی پیدا کردی ہے' کہ اگر ایک طویل زمانے کے بعد' ان کے فنون لطیفہ' ان کے اخلاق و عادات' اور ان کا فلسفہ ایک شخص کے سامنے پیش کیا جائے' تو اس کو فوراً" معلوم ہوجائے گا کہ ان لوگوں نے کس زمانے میں زندگی بسر کی ہے۔ اس مشابہت کی وجہ صرف اسلاف کی وہ تقلید ہے' جو وراثت' تربیت' آب و ہوا' اور سریان خیال وغیرہ کے ذریعہ سے پچھلی نسلوں نے کی ہے' یہ سچ ہے کہ پچھلی نسلیں اپنے اسلاف کی بعینہ تصویر نہیں ہوتیں' تاہم خیالات و احساسات کی کیفیت میں دونوں متحد ہوتی ہیں' اور اس سے لازمی طور پر ایک ہی قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن ہمارے لئے یہ نہایت خوشی کی بات ہے' کیونکہ قومی روح صرف تقلید' احساس اصول' عقائد' اور خیالات و تصورات کی مجموعی ترکیب ہے سے پیدا ہوتی ہے' اور اس روح کی تمام طاقتوں کا دارمدار اسی مجموعہ کی طاقت پر ہے' اور اسی کے بل پر قوموں کی زندگی قائم رہتی ہے' چنانچہ جب اس میں ضعف آتا ہے تو قوم کی بنیاد متزلزل ہوجاتی ہے' اس لئے وہی قوم کی حقیقی طاقت اور وہی قوم کی اصلی حکمران ہے' عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایشیائی بادشاہ عموماً" استبداد پسند ہوتے تھے' اور بادشاہت نفسانی کے سوا ان کا کوئی اصول نہ

تھا، لیکن یہ ہوا پرستی بھی ایک ایسے دائرے میں گھری ہوئی تھی جس سے کبھی باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ کیونکہ جس مجموعی قوت کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ ممالک مشرقیہ میں نہایت شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے، چنانچہ مذہبی تقلید کے اصول ہمارے یہاں بالکل متزلزل ہوگئے ہیں، لیکن مشرق میں اپنے پورے استحکام کے ساتھ قائم ہیں اور ایشیا کا سب سے بڑا استبداد پسند بادشاہ بھی اس قدیم روش کو نہیں ٹھکرا سکتا، کیونکہ ہر ایشیائی آدمی کے اعتقاد میں یہ دونوں چیزیں بادشاہوں سے زیادہ طاقت رکھتی ہیں۔

آج ہر متمدن آدمی ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جو تاریخی حیثیت سے ابتلاء و امتحان کا سخت ترین زمانہ ہے یہ ایک ایسا دور ہے جس میں ہمیشہ معتقدات پر بحث کی جاتی ہے، کیونکہ قدیم اصول جو تمدن کا اصلی ماخذ تھے، اپنے نفوذ قوت کو کھو چکے ہیں، اور جدید اصول کو اب تک ثبات و استحکام حاصل نہیں ہوا ہے، آج کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ دلوں پر رائے اور عادت کا کیا اثر ہوتا ہے؟ اور ان دونوں قوتوں پر حملہ کرنے کا کیا نتیجہ ہوگا؟ لیکن اگر وہ قدیم تمدن کی تاریخ کا یا کم از کم آج سے دو یا تین صدی پیشتر کے واقعات کا مطالعہ کرے تو اس کو ان کی حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔

بعض جاہل قصہ لوگوں کا بیان ہے کہ یونانی بالکل آزاد تھے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، وہ سر سے پاؤں تک اور عقیدہ کے غلام تھے۔ ان کے گرد معتقدات کا ایک دائرہ کھنچا ہوا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے، اور کوئی شخص اس عام قومی روش پر نکتہ چینی کرنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا، بلکہ وہ سب سے بڑھ کر اس کا پرستار بننا چاہتا تھا، یونانی دنیا نے مذہبی، یا شخصی، غرض کسی قسم کی آزادی کا خواب نہیں دیکھا بلکہ ایتھنز کے قواعد کی رو سے کوئی ملکی آدمی جماعت سے باہر رہ کر زندگی ہی نہیں بسر کرسکتا تھا، اسی طرح وطنی عید کے جشن نہ کرنے کا اس کو اختیار حاصل نہ تھا، قدیم زمانے کی آزادی صرف یہ تھی کہ آدمی اپنے مفتوحہ ممالک کے اصول کا غلام بن جائے، اور اس زمانے میں اگر کسی ملک کے کے باشندوں کو یہ اجازت دے دی جاتی کہ وہ اپنے خیالات میں آزاد ہوجائیں، تو یہ

ملک ان جماعتوں کے درمیان جن میں ہمیشہ جنگ قائم رہتی ہے' ایک دن بھی محفوظ نہ رہے۔ اب خدا' نظام حکومت' اور مذاہب سب کے سب گوشہ نشین ہوگئے ہیں' لیکن یہ دور اس دن سے شروع ہوا ہے' جن سے ان چیزوں میں آزادانہ بحث جائز سمجھی گئی ہے' لیکن اس زمانے کے تمدن نے تقریباً" ان تمام اصول کو فنا کردیا ہے' جن سے عادات اور عقیدہ کو مدد ملتی تھی اس لئے ان کا اثر بالکل زائل ہوگیا ہے۔ اور وہ فرسودگی کے اس دور سے گزر رہے ہیں جس میں اصول قدیمہ کی حقیقت اوہام سے زیادہ نہیں خیال کی جاتی' اور اب جب تک ان اصول کی جگہ جدید اصول نہ قائم ہوجائیں' خیالات میں طوائف الملوکی قائم رہے گی' لیکن اس طوائف الملوکی کو یہ فضیلت حاصل ہے' کہ وہ بحث و مناظرہ کی متحمل ہوسکتی ہے' اس بنا پر ہر انشاپرداز' ہر فلسفی' اور ہر غور و فکر کرنے والے دماغ کو شکر گزاری کے ساتھ اس دور سے سرعت کے ساتھ فائدہ اٹھانا چاہئے۔ کیونکہ جب وہ گزر جائے گا تو پھر دوبارہ واپس نہیں آئے گا' اس دور کو اگرچہ انحطاط و تنزل کا دور خیال کیا جاتا ہے' تاہم اس میں عقل کو کامل آزادی سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے' اس لئے وہ بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا' کیونکہ تمدن جدید کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپین قومیں ایسے دور کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں' جو بحث' اور مباحثہ' اور حریت و آزادی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی جدید مذہب اس وقت تک استحکام نہیں حاصل کرسکتا جب تک اس میں نقد و بحث کا سدباب نہ ہوجائے' اور قدیم مذاہب کی طرح وہ معارضہ کا متحمل نہ ہوسکے' اس زمانے میں انسان ان اصول پر ہمیشہ بحث کرتا ہے جن پر آئندہ تمدن کی بنیاد رکھی جائے گی' لیکن یہ نہایت خطرناک چیز ہے کیونکہ قومی زندگی پر سب سے زیادہ اساسی اصول کے تغیر و تبدل کا اثر پڑتا ہے' شورش اور جنگ بہت زیادہ موثر چیز نہیں' ان کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح ہوسکتی ہے' لیکن ان اصول کے بدلنے سے تمام تمدنی شاخوں میں تغیر پیدا ہوجاتا ہے' اس لئے جس شورش سے تمام قوموں کی زندگی معرض خطر میں پڑ جائے گی' وہ صرف وہ شورش ہے' جو خیالات و افکار میں پیدا

ہو گی۔

اگر ایک قوم کسی جدید اصول کو اختیار کرتی ہے' تو یہ کوئی خطرناک بات نہیں' اصل خطرہ اس حالت میں پیدا ہوتا ہے' جب قوم ایک اصول کو چھوڑ کر دوسرے اصول کو اختیار کرنا چاہتی ہے' کیونکہ جب تک وہ نئی عمارت کی بنیاد قائم نہیں کرلیتی یہ خطرہ باقی رہتا ہے' یہ بھی کوئی خطرناک بات نہیں کہ وہ اصول بجائے خود صحیح نہیں' آج تک ہم نے جن مذہبی خیالات کے ساتھ زندگی بسر کی ہے' وہ بھی غلط تھے خطرہ ان متعدد تجربوں میں ہے' جو قوم کی حالت اور ان اصول کی موزونیت دریافت کرنے کے لئے لازمی طور پر کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ جب تک متواتر تجربے نہ کرلئے جائیں' قوم کو ان اصول کے فوائد کا حال معلوم نہیں ہوسکتا' موجودہ اشتراکیت (سوشیالزم) قوم کو انحطاط کے جس غار اور استبداد کے جن مناظر شنیعہ کی طرف لے جاتی ہیں قوم کو اس سے ہوشیار کرنے کے لئے اگر علم النفس اور علم الاقتصاد کی کامل مہارت ضروری نہیں ہے' تو اس کو اس انجیل جدید (اشتراکیت) کے قبول کرنے سے کیونکر روکا جاسکتا ہے؟

تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ جس زمانے میں لوگ کسی عقیدہ کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے' اس میں اس کی دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے؟ لیکن انسان تاریخ سے عبرت نہیں حاصل کرسکتا' شارلمان نے رومن سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا' لیکن چونکہ اتحاد کا اصول آسانی کے ساتھ قائم نہیں ہوسکتا تھا' اس لئے اس کی کوششیں بے کار ہوگئیں۔ نپولین کی جدوجہد کا بھی یہی انجام ہوا' فلیپ ثانی نے اپنی تمام ذہانت' اسپین کی پوری طاقت' اور اپنے عالمگیر اثر کو اس آزادانہ بحث کے مقابلہ میں جو پروٹسٹنٹ کے نام سے تمام یورپ میں پھیل رہی تھی صرف کردیا لیکن بالآخر اس کو بھی ناکامی ہوئی اور اس جنگ نے اسپین کو اس قدر برباد کیا کہ پھر دوبارہ نہ سنبھل سکا ہمارے زمانے میں بھی ایک ابولہوس سرپر تاج پہن کر اٹھا' اور اپنے عام قومی احساس کے اقتضاء سے ایک وہی اصول کی دعوت دی یعنی متحد الجنس قوموں میں اتحاد پیدا کرانا چاہا' اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جرمنی اور اٹلی میں یہ اتحاد پیدا ہوگیا اور یہ دونوں ملک ہمارے

قبضہ سے نکل کر ایک زمانہ دراز کے لئے ہم سے علیحدہ ہوگئے' تمام قومیں ایک بدترین مذہب کے جال میں گرفتار ہوگئی ہیں' اور انھوں نے فوجوں کی تعداد میں اضافہ کرکے' براعظم یورپ میں مسلح پاسبانوں کی ایک قطار کھڑی کردی ہیں' لیکن اس کا نتیجہ افلاس کے سوا اور کیا ہوگا؟ اور اگر بالفرض اس فوج گراں نے اپنی دولت اتحاد' اور قوت کا کچھ حصہ محفوظ بھی رکھا تو اشتراکیت (سوشیالزم) جو شخصی حکومتوں کو مٹاکر ان کی جگہ ایک عام قومی حکومت کرنا چاہتی ہے' اس کو ایک نہ ایک دن ضرور فنا کردے گی۔

قوموں پر جن اصول کا اثر پڑتا ہے' ان میں سب سے زیادہ قوی اصول قومیت کا ہے' قدیم سیاست دان اس کو نہایت اہم سمجھتے تھے اور اس کو سیاست کا محور قرار دیتے تھے لیکن اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہوا' کیونکہ یورپ نے اس کے مستحکم کرنے کے لئے جو کوششیں کیں' ان کی وجہ سے وہ نہایت خطرناک جنگ میں مبتلا ہوگیا' اور اس کو بغل میں ہتھیار رکھ کر رات بسر کرنی پڑی اس اصول کی حمایت میں جو جدوجہد جاری تھی اسکا سبب صرف یہ خیال تھا کہ قوموں کی تعداد و عظمت میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے' اسی قدر وہ خطرات سے محفوظ رہتی ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی قومیں نہایت آسانی کے ساتھ مفتوح ہوسکتی ہیں اور اب تو یہ بالکل ثابت ہوگیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی قومیں تمام بلاؤ سے محفوظ رہتی ہیں' چنانچہ اس کے ثبوت میں پرتگال یونان' سوئٹزرلینڈ' بیلجیم' سویڈن' اور ریاستہائے بلقان کو پیش کیا جاسکتا ہے' اسی اتحاد نے اٹلی کو بالکل تباہ کردیا' اس اتحاد سے اگرچہ اس کے تمام صوبوں کی آمدنی دو ملیار ہوگئی' تاہم وہ سخت افلاس میں مبتلا ہوگئی اور قریب تھا کہ وہاں شورش برپا ہوجائے۔ حالانکہ اتحاد کے پہلے اگرچہ اس کی آمدنی صرف ۵۵۰ ملین تھی لیکن تمام ملک سرسبز اور خوشحال تھا' لیکن خیالات کا سیلاب جب دلوں سے ٹکرا جاتا ہے' تو اس کو کون روک سکتا ہے؟ اور اپنا دورہ پورا کرکے رہے گا' اور اس کی تائید وہ لوگ کریں گے جن کے لئے تقدیر نے سب سے پہلے اس کی قربان گاہ پر چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے' جس طرح بکری اپنے چرواہے کے پیچھے پیچھے مذبح کی طرف نہایت

اطاعت و فرماں برداری کے ساتھ چلی جاتی ہے' اسی طرح ہم کو بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کردینا چاہئے' کیونکہ اصول اپنے دور انقلاب میں جب ایک خاص نقطے پر پہنچ جاتے ہیں تو ان کو مقابلے میں دلیل بالکل بیکار ہوجاتی ہے' اور قوت بیانیہ ان پر غالب نہیں آسکتی' اگر کسی اصول نے کسی قوم کے دل پر تسلط حاصل کرلیا ہے تو وہ ان کی پابندیوں سے صرف دو طریقوں سے آزاد ہوسکتی ہے' یا تو ایک طویل زمانہ گزر جائے' یا کوئی شورش برپا ہو' اور کبھی کبھی تو ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے' دنیا میں کتنے ادہام ہیں' جن کے ادب و احترام کو انسان اپنے اوپر فرض کرلیتا ہے' پھر خود ان کے پردے کو چاک کردیتا ہے؟

دوسری فصل

انقلاب تمدن پر مذہبی عقائد کا اثر

مذہبی عقائد کے اثر کی اہمیت' مذہبی عقائد ہمیشہ قوموں کی زندگی کا جزو اعظم تھے' اکثر تاریخی واقعات نظام حکومت' اور نظام تمدن' مذہبی اصول سے ماخوذ ہیں۔ ہر جدید مذہبی اصول کے ساتھ ایک نیا تمدن لازمی طور پر پیدا ہوجاتا ہے' مذہبی خیال کی قوت' مذہب کا اثر اخلاق پر' مذہب تمام ملکات کو متحد المقصد بنادیتا ہے' ہر قوم کی سیاست' صنعت و حرفت' اور اخلاق کی تاریخ اس کے مذہبی عقائد سے پیدا ہوتی ہے۔ مذہبی عقائد کا ادنی تغیر بھی قومی زندگی میں عظیم الشان انقلاب پیدا کردیتا ہے' اس کی مختلف مثالیں۔

تاریخ کا منارہ' تمدن کا ستون' قوموں کی زندگی کا اہم اصول' اگر کوئی چیز ہے' تو وہ صرف مذہبی اصول ہیں۔ اس بنا پر ہم ان پر ایک مستقل فصل میں بحث کرتے ہیں۔

مذہبی اصول ہمیشہ قوموں کی زندگی کا نہایت اہم عنصر' اور تاریخ کا نہایت نمایاں جزو تھے' چنانچہ تاریخ کے عظیم الشان واقعات نے جو عظیم الشان نتائج پیدا کئے' ان میں مذاہب کے بننے اور بگڑنے کا نتیجہ سب سے زیادہ اہم ہے' اور گزشتہ اور موجودہ زمانے میں جو اساسی مسائل قرار دیے گئے ان میں پہلا اساسی مسئلہ' یہی مذہب تھا' اگر انسانیت اپنے معبودوں کی موت پر راضی ہوتی تو آغاز تمدن سے جو واقعات ظہور پذیر ہوئے' ان میں یہ واقعہ سب سے زیادہ عظیم

الشان ہوتا۔

ہم کو یہ بھولنا نہ چاہئے کہ تاریخ کے ابتدائی زمانے سے آج تک ہر نظام حکومت اور ہر نظام تمدن کا سنگ بنیاد مذہبی عقائد کی سطح پر رکھا گیا ہے' یہی معبود ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کا سب سے بڑا دور تمثیل کیا ہے' مذہب اس سرعت کے ساتھ اخلاق پر اثر ڈالتا ہے' کہ اس معاملہ میں عشق کے سوا کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی' لیکن آخر عشق بھی تو ایک مذہب ہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ شخص مذہب ہے اس لئے ہمیشہ قائم نہیں رہتا' اگر تم اس قوم کی حالت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو' جو صرف احساس خیال سے متاثر ہوکر بپھر گئی' تو تم کو فتوحات عرب کو' صلیبی لڑائیوں کو' اندلس کی ظلم آرائیوں کو' پر یٹن (۱) کے زمانے میں انگلستان کی حالت کو' فرانس میں سینٹ بار تھولومیو (۲) کو' اور شورش فرانس کی ہر لڑائی کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اوہام کے اندر ایک ایسا موثر جادو چھپا ہوا ہے' جو مزاج عقلی کو بالکل بدل دیتا ہے' انسان نے خود اپنے معبودوں کو پیدا کیا ہے' لیکن چند ہی دنوں میں ان معبودوں نے اس کو اپنا غلام بنالیا' مذہب خوف سے نہیں بلکہ امید سے پیدا ہوا ہے' اس لئے اس کا اثر دائمی ہوتا ہے' یہ مذہب ہی کا اثر ہے کہ اس نے انسان کی عقل کے سامنے سعادت کا دروازہ کھول دیا ہے اور اس بنا پر تمام موثرات سے ممتاز ہوگیا ہے' اور فلسفہ اس منزل سے اب تک کوسوں دور ہے۔

ہر تمدن' ہر فلسفہ' اور ہر مذہب کی غایت یا کم از کم اس کا نتیجہ' ان مخصوص حالات کا نفسیہ کا پیدا کرنا ہے' جن میں بعض اگرچہ مایہ سعادت ہوتے ہیں' اور بعض نہیں ہوتے۔ تاہم خارجی حالات سے زیادہ سعادت کا دارمدار انہی حالات نفسیہ پر ہے۔ بہت سی قربانیاں آگ کے اوپر اپنے قاتلوں سے زیادہ سعادت اندوز ہوتی ہیں' اور بہت سے وہ کاشتکار جو اپنے ہاتھ سے ہل جوت کر روٹی کے ایک ٹکڑے پر قناعت کرلیتے ہیں' ایک دولت مند امیر سے جس کو افکار نے گھیر لیا ہے' خوش قسمت ہوتے ہیں۔

ایک نہایت افسوسناک بات ہے کہ تمدن جدید نے انسانی ضروریات کو

غیرمعمولی طور پر وسیع کردیا ہے' اور ان کے پورے کرنے کے لئے کم اسباب مہیا کئے ہیں۔ اس لئے دلوں سے رضا و تسلیم کا مادہ بالکل زائل ہوگیا ہے' کہا جاتا ہے کہ تمدن جدید ترقی کا فرزند رشید ہے' لیکن درحقیقت وہ اشتراکیت (سوشیالزم) اور نارکزم کی ماں ہے۔ جن لوگوں نے ایمان کی قوت کو کھودیا ہے اور یاس و حران نے ان کے قلوب کا احاطہ کرلیا ہے' وہ انہی دونوں الفاظ کا نعرہ بلند کرتے رہتے ہیں' کیا ایک یورپین جو ایک دائمی اضطراب میں مبتلا رہتا ہے' جس کے اعصاب دماغی متزلزل ہوگئے ہیں' جو اپنی تقدیر پر قانع نہیں ہے' اس مشرقی آدمی کا مقابلہ کرسکتا ہے' جو راضی برضائے آلٰہی ہے؟ ان دونوں کے درمیان روحانی حالت کے سوا اور کسی چیز میں فرق نہیں ہے۔ قوموں کو صرف وہی شخص بدل سکتا ہے جو اس کے خیالات کو بدل کر' اس کے عقائد و اعمال میں انقلاب پیدا کردیتا ہے' اس وقت سوسائٹی کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ایسی کیفیات نفسیہ کے پیدا کرنے کی کوشش کرے جن کی وجہ سے ہر فرد سعادت مند ہوجائے ورنہ قوموں کی زندگی کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ دنیا میں آج تک جو قومیں ابھریں ان کا دار مدار صرف ان خیالات پر تھا جن کے اندر دلوں کے جذب و کشش کی قوت مضمر تھی' اور ان میں جو قوم ابھر کر بیٹھ گئی اس کا سبب صرف انہی خیالات کی قوت کا زوال تھا' اس زمانے کا سب سے غلط خیال یہ ہے کہ 'انسان کی سعادت صرف خارجی اشیاء کے اندر ہے' لیکن یہ کسی کو نہیں سوجھتا کہ وہ خود ہمارے اندر پنہاں ہے اس کو پیدا کرتے ہیں' اور وہ بہت کم ہم سے الگ رہتی ہے' ہم نے قدیم خیالات کی بنیاد ڈھادی ہے' اس لئے ہم کو نظر آتا ہے کہ اس خیال کے بعد ہماری زندگی فنا ہوجائے گی' اور اگر ہم نے اس کے عوض کوئی دوسرا اعتقاد قائم نہ کیا تو ہم برباد ہوجائیں گے۔

نوع انسانی کے سب سے بڑے محسن جن کی یادگار میں تمام قوموں کو زرخالص کا مجسمہ قائم کرنا چاہئے وہ سحر آفرین لوگ ہیں جنھوں نے قوموں کے لئے خیالات پیدا کئے ہیں' یہ لوگ اگرچہ کبھی کبھی جماعت انسانی میں نمایاں ہوجایا کرتے ہیں' لیکن عموماً" بہت کم پیدا ہوتے ہیں' انہی بزرگوں نے امید ہائے فانی

کے سامنے جن کے سوا انسان کسی دوسری حقیقت کو نہیں جان سکتا' اور اس غیر متحرک ترش رو دنیا کے آگے' پرزور خیالات کا ایک پردہ نورانی قائم کیا ہے انسانیت کی حقیقی تفسیر کی' اور خارزار زندگی کے تمام کانٹوں کو ہٹاکر انسان کے لئے جنت کا راستہ صاف کردیا' جس کے ساتھ تمام امیدیں وابستہ ہیں۔

اگر ہم سیاسی حیثیت سے بھی نگاہ ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ مذہبی عقائد کا اثر کس قدر شدید ہے؟ مذہب کی عظیم الشان قوت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ایک زمانے میں قوم کے فوائد قوم کے احساسات اور قوم کے خیالات کو متحد کردیتا ہے' اس لئے وہ ان تمام عناصر کا جن سے قومی روح پیدا ہوتی ہے دفعتاً" قائم مقام ہوجاتا ہے' یہ سچ ہے کہ مذہبی قوت کے استیلاء سے قوم کا مزاج عقلی نہیں بدل جاتا تاہم تمام قوموں کا رخ صرف ایک مقصد کی طرف ہوجاتا ہے' یعنی تمام طاقتیں اس جدید مذہب کی حمایت میں کھڑی ہوجاتی ہیں' اور مذہب کی عظیم الشان طاقت کا راز اسی اصول کے اندر مضمر ہے' یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے کارہائے نمایاں کئے ہیں' اسی قسم کے مذہبی انقلاب کے زمانے میں کئے ہیں' اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی تاسیس اسی دور انقلاب میں ہوئی ہے' آنحضرت ﷺ کے الہامی خیالات نے اسی طریقہ سے قبائل عرب میں اتحاد پیدا کیا' اور ان لوگوں نے تمام قوموں کو زیر و زبر کرکے عظیم الشان سلطنت قائم کرلی نفس اعتقاد کوئی چیز نہیں ہے' اصلی چیز وہ قوت ہے' جو عقائد کو دل میں مرتکز کردیتی ہے' ایک وحشی سے وحشی دیوتا کی طرف بھی اگر لوگوں کو دعوت دی جائے تو وہ بھی اسی طرح موثر ہوسکتی ہے' بلکہ اکثر سنگدل و استبداد پسند معبودوں کے اثر نفوذ نے بھی نہایت وسعت حاصل کرلی ہے' کیونکہ جو معبود و غیر متعصب اور نرم خو ہوتے ہیں' ان کے پرستاروں کے عزم و ارادہ میں شدت و صلابت نہیں ہوتی' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع صرف آپ کے تشدد (۳) کی وجہ سے تمام دنیا پر چھاگئے' اور دنیا کے ایک بڑے حصے پر ایک مدت تک ان کا تسلط' اور رعب قائم رہا لیکن ساکن القلب بودھا کی امت نے کوئی کار نمایاں نہیں کیا' اور تاریخ نے ان کو بالکل فراموش کردیا۔

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ قوموں کی سیاست میں ہمیشہ مذہب نے نمایاں حصہ لیا ہے' کیونکہ صرف وہی ایک ایسی قوت ہے جو نہایت سرعت کے ساتھ نظام اخلاق کو متاثر کرلیتی ہے' یہ سچ ہے کہ یہ معبود ہمیشہ باقی نہیں رہتے' لیکن مذہب ہمیشہ قائم رہتا ہے' اسی مذہبی قوت کی بدولت فرانس نے جب ایک صدی تک تمام یورپ کا مقابلہ کیا تو دنیا نے دوبارہ مذہبی عقائد کے اثر کا اعتراف کیا' کیونکہ جو خیالات اس زمانے میں دلوں پر محیط ہوگئے تھے' انھوں نے بھی درحقیقت ایک جدید مذہب کی صورت اختیار کرلی تھی جس نے قوم کو قالب میں اپنی روح پھونک کر اس کو دفعتاً" ابھار دیا تھا' لیکن جو معبود ان خیالات کے پردوں سے نمایاں ہوئے' ان کا قالب نہایت لطیف تھا' اس لئے چند ہی دنوں تک قائم رہ سکے۔ تاہم کم از کم ان کی زندگی تک ان کا اثر شدید و عام رہا۔

اگرچہ قومی روح کے انقلاب پر مذہب کو جو قدرت حاصل ہے وہ لازوال اور غیرفانی ہے تاہم اس کی اصلی حالت اتنی مدت تک قائم نہیں رہتی کہ نظام اخلاق کو بالکل بدل دے' کیونکہ خواب و خیال کی یہ قوت روزبروز ضعیف ہوتی جاتی ہے' اور جو لوگ اس کے نشے میں چور تھے آہستہ آہستہ بیدار ہوتے جاتے ہیں' یہاں تک کہ مذہب بھی اپنے انتہائی زمانے میں اس رنگ میں نمودار ہوتا ہے' جس میں قوم نے اس کو شرابور کردیا ہے' اگر انگلستان' اسپین اور فرانس کے ان تمام فرقوں پر نظر ڈالی جائے' جو ایک ہی مذہب میں پیدا ہوگئے تھے' تو نظر آئے گا کہ اسپین میں پروٹسٹنٹ مذہب قائم ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ اور انگلستان محکمہ احتساب (مجلس انکویزیشن) کے قائم کرنے کی اجازت ہی نہیں دے سکتا تھا' بلکہ اگر خود پروٹسٹنٹ کی پابند قوموں کی حالت پر بھی غور کیا جائے تو ان کی اساسی اخلاق بھی علانیہ نمایاں ہوجائیں گے' اور معلوم ہوجائے گا کہ باوجود اس مذہب کی شیفتگی کے انھوں نے اپنے مزاج عقلی کی امتیازی خصوصیات یعنی استقلال' عزم' تدبر' اور خودداری کو قائم رکھا ہے' اور ہواپرست بادشاہوں کی ذلیل اطاعت پزیری کو ٹھوکر لگادی ہے۔

ہر قوم کی سیاسی' اخلاقی' اور صنعتی تاریخ اگرچہ اس کے مذہب سے پیدا

ہوتی ہے، لیکن جس طرح مذہب نظام اخلاق پر اثر ڈالتا ہے، اسی طرح خود نظام اخلاق سے متاثر بھی ہوتا ہے اس بنا پر ہر قوم کی زندگی کے رکن اعظم صرف دو ہیں، مذہب اور اخلاق، لیکن ہر قوم کا نظام اخلاق اپنے اصلی اوصاف کے لحاظ سے ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اور اسی خصوصیت نے ہر قوم کی تاریخ کو متحد اور جامع و مانع بنادیا ہے مگر مذہب نے اپنے اندر تغیر پزیری کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اسی تغیر کی بنا پر قوموں کی تاریخ میں بہت سے انقلابات کی سرگزشت نظر آتی ہے۔

معمولی مذہبی تغیر بھی متصل و متواتر انقلابات کا پیش خیمہ ہوتا ہے ہم نے گزشتہ فصل میں بیان کیا ہے کہ اٹھارویں صدی کے فرنچ، سترھویں صدی کے فرنچ لوگوں سے بالکل مختلف ہیں، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ، سترھویں صدی کی عقل اٹھارویں صدی میں عالم لاہوت سے اتر کر علمی دنیا میں آگئی اور تقلید کا مقابلہ استدلال سے اور نقل کا مقابلہ عقل سے ہوگیا، اس بنا پر صرف خیالات کے ان تغیرات نے دونوں زمانوں میں نمایاں فرق پیدا کردیا، اگر ہم زیادہ تحقیق کریں تو ثابت ہوگا کہ شورش فرانس، اور اس کے بعد کے واقعات، جو آئندہ بھی ہمیشہ بھی ظہور پزیر ہوتے رہیں گے صرف عقائد کے انقلابات کا نتیجہ تھے۔

آج قدیم قوموں میں رو بہ تنزل ہیں، اور اس لئے ضعف سے کانپ رہی ہے ان کے نظام کا ہرستون پے درپے گر رہا ہے، لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی قوت ایمان کو جس پر ان کے وجود کا دارومدار تھا آہستہ آہستہ کھوتی جاتی ہیں، اور جس دن اس قوت کا کل سرمایہ ضائع ہوجائے گا، ان کی جگہ ایک جدید تمدن لے لے گا۔ جو جدید عقائد پر مبنی ہوگا کیونکہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ، جب قوموں کے معبود پردہ خفا میں چھپ جاتے ہیں تو وہ بہت دنوں تک زندہ نہیں رہتیں، اور جو تمدن ان معبودوں کے ساتھ آیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ رخصت ہوجاتا ہے۔ اس بنا پر ہر قوم کو ہوشیاری کے ساتھ یقین کرلینا چاہیئے کہ مرنے والے معبودوں سے زیادہ کوئی چیز برباد کرنے والی نہیں ہے۔

(۱) PARITON انگریزی فرقہ پروٹسٹنٹ کی شاخ یہ لوگ بالکل زاہد خشک ہوتے ہیں، موسیقی و لہو و لعب کو حرام جانتے ہیں، ہر بات میں مسیح کی زندگی کی تقلید کو واجب سمجھتے ہیں

(۲) SAINTBART HOKOMEO مسیحیوں کے یہاں بہت مقدس شہید سمجھے جاتے ہیں، ۲۴ اگست ۱۵۷۲ء کو جو ان کے سالانہ فاتحہ کا دن تھا چارلس نہم شاہ فرانس نے فرقہ پروٹسٹنٹ پر مظالم شروع کئے، جن کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف مقتولین کی تعداد بہ اختلاف روایات ۳۰۰۰۰ سے لے کر ۶۰۰۰۰ تک پہنچی ہے۔

(۳) تشدد نہیں بلکہ عزم و استقلال، استبداد نہیں بلکہ جمہوریت، تعصب نہیں بلکہ حق کی حمایت۔

تیسری فصل

اکابران قوم کا درجہ قوموں کی تاریخ میں

قوموں کی عظیم الشان ترقیاں صرف بلند خیال لوگوں کے ہاتھ سے انجام پزیر ہوتی ہیں' ان کے درجہ کی حقیقت' وہ قوم کی تمام مجموع کوششوں کا مرقع ہوتے ہیں' چند مثالیں جو عظیم الشان انکشافات سے ماخوذ ہیں' اکابر رجال کا درجہ سیاست میں' وہ قوم کے غالب خیال کا مرکز ہوتے ہیں۔ ابلہ فریب بزرگوں کا اثر بڑے بڑے محققین قوم کے تمدن کو بدل دیتے ہیں۔ متعصب اور ابلہ فریب بزرگ تاریخ کے موجد ہیں۔

قوموں کی تقسیم' اور ان کے باہمی امتیازات کے سلسلہ بحث میں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ مغرب و مشرق میں صرف یہ فرق ہے کہ مغرب میں ترقی یافتہ اکابران قوم کا ایک گروہ موجود ہے' جس سے مشرقی ترقی کا میدان بالکل خالی ہے' اس فصل میں ہم اسی گروہ کی حیثیت کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔

یہی ممتاز گروہ ہے جو قوم کی تمام طاقتوں کا مرکز ہے اور اگر ہم اس کو نسل انسانی کے سلسلہ خارج کردیں' تو دفعتاً" قوم کی عقلی سطح کا ارتفاع مبدل بہ پستی ہوجائے گا' علوم و فنون صنعت و حرفت' غرض تمام تمدنی ترقیاں اسی گروہ کی ممنون احساس ہیں' اور تاریخی دستاویز سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم ان تمام چیزوں میں اس کے قرض دار ہیں'

اگرچہ تمام قوم ان ترقیوں سے یکساں طور پر فائدہ اٹھاتی ہیں اور اگرچہ

نوع انسانی کا یہ گل سر سبد انھیں کے درمیان شگفتہ ہوتا ہے' تاہم قوم اس کی پوری قدردانی نہیں کرتی' یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے لوگ خود اپنی قوم کے غیظ و غضب کا شکار ہوگئے' اور قوم کو اس کا احساس بھی نہ ہوا کہ گزشتہ نسلوں نے پودوں نے انھی ترقی یافتہ دماغوں کی بدولت نشوونما پائی تھی' یہ لوگ درحقیقت قوم کا سرمایہ ناز ہیں' اور ان میں چھوٹے سے چھوٹا فرد بھی ہمارے لئے مایہ عز و افتخار ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اتفاقی طور پر یا معجزانہ طاقت سے پیدا نہیں ہوئے ہیں' بلکہ وہ زمانہ گزشتہ کی طویل گردشوں کا نتیجہ ہیں' انھی کے قالب میں ان کی قوم اور ان کے زمانے کی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ اور ہر وہ چیز جس سے انکی کوششوں کی کلیاں کھلتی ہیں ترقی کی اشاعت کا سبب ہوتی ہیں' اس لئے اگر ہم مساوات عامہ کے خواب پریشان کو جس نے ہماری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں' بھلادیں' تو ہم سب سے پہلے ان لوگوں پر قربان ہونے کے لئے تیار نظر آئیں گے مساوات عامہ درحقیقت پست درجہ کے طبقوں میں پائی جاتی ہے۔ اور عقلی ٹکڑ گدے اگرچہ ہمیشہ اس کا خواب دیکھا کرتے ہیں' لیکن ان کا خواب ان کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔

اس خواب کی تعبیر صرف وحشی قوموں پر صادق آسکتی ہے' ترقی یافتہ قوموں کے افراد میں صرف اس وقت مساوات پیدا ہوسکتی ہے' جب طبقہ اعلیٰ کو گرا کر پست درجہ کے طبقوں کے برابر کردیا جائے۔

لیکن علماء رجال کی قدر و منزلت صرف تمدنی ترقی تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس کا انحصار تمام تر اس حقیقت میں ہے کہ "وہ تمام قوم کی مجموعی کوششوں کا مظہر ہیں" ان محققین کی تحقیقات بہت سی گزشتہ تحقیقاتوں کا نتیجہ ہے' اور وہ صرف انھی پتھروں کو عمارت میں لگاتے ہیں' جن کا نقشہ ہمارے اسلاف نے مدتوں میں تیار کیا تھا۔ لیکن تمام مورخین کا فطری مذاق اشیاء کی تفصیل بیان کرنا ہے' اس لئے وہ ہر ایجاد کو کسی نہ کسی نام کی طرف ضرور منسوب کردیتے ہیں' حالانکہ تمام بڑی بڑی ایجادیں جنھوں نے کرہ ارضی کی ہیئت کو بدل دیا' کسی خاص شخص کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتیں۔ مطبع بارود' اسٹیم' اور تار کے

موجدوں کا نام کس کو معلوم ہے؟ اس بنا پر جو شخص ان ایجادات کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کرے گا اس کو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت بہت سے گزشتہ دماغ پاشیوں کا نتیجہ ہیں' اور اخیر موجد اس عمارت کا صرف ایک "بلند کنگرہ" ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے گیلیو (۱) نے یہ دریافت کیا تھا کہ "اگر ایک قندیل فضا میں معلق کی جائے تو اس کے نور کا تموج مساوی حرکت کے ساتھ نمایاں ہوگا" کرنومترنے اسی سے گھڑیوں کی ایجاد کا خیال پیدا کیا' اور ملاحوں نے "سطح آب پر راہ دکھانے کا آلہ" اسی سے ایجاد کیا' توپوں کی بارود یونانی آگ سے رفتہ رفتہ ایجاد ہوئی اور آلات بخاریہ کی اختراع متعدد تعجب انگیز کوششوں کا نتیجہ ہے دنیا میں دفعتاً" کوئی چیز وجود میں آ ہی نہیں سکتی' اگر ایک یونانی ارشمیدس (۲) سے سو گنا زیادہ عقل رکھتا ہو تب بھی وہ دفعتاً" ریلوے ٹرین نہیں بناسکتا' اور اگر وہ اس تیار بھی کرلے تو اس کو چلا نہیں سکتا کیونکہ اس کے جاری کرنے کے لئے علم آلات سازی (میکانک) کے اس قدر ترقی کی ضرورت ہے' جو آج اس کو دو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ بانیان سیاست کو زمانہ گزشتہ کے تاریخی سلسلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن درحقیقت وہ بھی موجدین اور مخترعین کی طرح دور ماضی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں لیکن (۳) ہیگل' کوسن' اور کارلائل جیسے انشاپردازوں کی آنکھوں کو ان مدبرین کے انقلاب انگیز کارناموں نے بالکل خیرہ کردیا' اس لئے انھوں نے ان کو خدا بنادیا جو تنہا دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ یہ لوگ قوم کی انقلابی حالت میں تغیر و تبدل پیدا کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں' لیکن صرف یہ قدرت ان کی زندگی کی تدریجی رفتار کو نہیں بدل سکتی' یہاں تک کہ کرامویل اور نپولین جیسے اولوالعزم لوگ بھی اس معرکہ سے عہدے برا نہیں ہوسکتے' بہت سے فاتح' شہروں کو لوہے اور آگ سے منہدم کرسکتے ہیں' آدمیوں کو ہلاک کرسکتے ہیں' ملکوں کو برباد کرسکتے ہیں' لیکن ہم کو اس قوت تخریب کے مغالطہ میں آکر ان کی اصلی حیثیت کے انداز کرنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ جب تک ان کی قوت ضرورت زمانہ کے قالب

میں ڈھل نہ جائے' ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہوسکتا' اس بنا پر ان کی کامیابی کا حقیقی سبب ان کے وجود سے مدتوں پیشتر موجود رہتا ہے' قیصر نے روم میں اور وشو نے فرانس میں اسی طریقہ پر کامیابی حاصل کی اور اگر ان کے زمانے سے دو یا تین صدی پیشتر اسی درجہ کے دو آدمی پیدا ہوتے تو ایک روم کی عظیم الشان جمہوریت کو کسی استبداد پسند فرماں روا کے ارکان کا تابع نہیں کرسکتا' اور دوسرا فرانسیسی اتحاد کے قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا' اس لحاظ سے صرف مدبران سیاست ہی وہ لوگ ہیں جو قوم کی قریب تر آنے والی ضرورتوں کو مشخص کرتے ہیں اور ان واقعات کو عالم ظہور میں لاتے ہیں' جن کے اسباب معدہ کو زمانہ پہلے سے مہیا کرچکا تھا اور قوم کو وہ راستہ دکھاتے ہیں جس پر اس کو چلنا چاہیے۔ یہ ممکن ہے کہ تمام قوم کو وہ راستہ پہلے سے معلوم نہ ہو لیکن تقدیر نے قومی انقلاب کے جو اسباب جمع کردیئے ہیں' وہ قوم کو جبراً" اس شاہراہ پر ڈال ہی دیتے ہیں' ان اسباب کی بنا پر درحقیقت بانیان سیاست بھی موجدین اور مخترعین کی طرح قدیم اور مسلسل کوششوں کے نتائج کو نمایاں کرتے ہیں۔

لیکن ہم کو اکابران قوم کے مختلف طبقات کے موازنہ میں اس حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے کیونکہ آئندہ زمانے میں اگرچہ تمدن پر موجدین و مخترعین کا عظیم الشان اثر پڑتا ہے' لیکن عملاً" قوم کی سیاسی تاریخ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا' جس کی وجہ یہ ہے کہ ہل کے موجد سے لے کر تار کے موجد تک بلکہ دنیا کے تمام مخترعین میں وہ اخلاقی اوصاف نہیں پائے جاتے' جنکی سطح پر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی جاتی ہے' یا کوئی ملک فتح کیا جاتا ہے' غرض وہ قدرت کے ان فیاضانہ عطیات سے بالکل محروم ہوتے ہیں' جن کے ذریعہ سے علانیہ دنیا کی تاریخ بدل دی جاتی ہے' یہ لوگ ان اوصاف سے اس لئے معرا ہوتے ہیں' کہ ان کو جن ایجادات کے متعلق طویل غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس قدر دقت طلب اور پیچیدہ ہوتی ہیں کہ ان کا اثر ان کے علم و یقین کو ضعیف کر ڈالتا ہے' ایک وجہ یہ بھی ہے' کہ غور و فکر کرنے والوں کو مادی فوائد کی بہت کم طمع ہوتی ہے' اس بنا پر وہ ان کی بہت کم پروا کرتے ہیں ان اسباب کا لازمی نتیجہ یہ

ہے کہ موجدین و مخترعین صرف زمانہ کی روش کے مطابق تمدنی انقلاب پیدا کرسکتے ہیں، لیکن متعصب، محدود خیال، اور مضبوط کیریکٹر کے مقتدایان قوم جدید مذاہب کو قائم کرسکتے ہیں، سلطنتوں کی بنیاد ڈال سکتے ہیں اور نظام عالم کو الٹ پلٹ دے سکتے ہیں، ایک پیٹرس راہب کی آواز نے یورپ کے ہزاروں آدمیوں کو مشرق کی طرف جھونک دیا، ایک محمد صلعم کی آواز نے دنیائے قدیم یعنی یونان اور روم کو تہ و بالا کردیا، اور لوتھر جیسے گمنام راہب نے تمام یورپ کی اٹھاکر آگ اور خون کے سمندر میں ڈال دیا، لیکن دنیا نے گلیلو اور نیوٹن کی آواز کی طرف کان بھی نہیں لگایا۔ غرض موجدین و مخترعین تمدن کی رفتار کو صرف تیز و سریع کردیتے ہیں لیکن پیشوایان مذہبی ایک مستقل تاریخی دور کو پیدا کرتے ہیں۔

تاریخ صرف ان واقعات کا مجموعہ ہے، جن کے ذریعہ سے انسان نے ایک خیال قائم کیا اس کی پرتش کی، اور پھر اس کو فنا کردیا، اگرچہ علمی حیثیت سے ان خیالات کی وقعت اس سراب سے زیادہ نہیں، جس کی حرکت ریگستان میں ایک زود فنا چمک پیدا کردیتی ہے، لیکن جن لوگوں نے اس سراب کو پیدا کیا ہے، انھوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے، اور اب بھی اگرچہ وہ عدم آباد میں سکونت پذیر ہیں، تاہم تمام دنیا کی گردنیں ان کے نفوذ و قوت کے سامنے جھک جاتی ہیں، اور قوموں کے نظام اخلاق کی تبدیلیوں پر قیامت تک ان کا اثر پڑتا رہے گا، اس لئے ہم کو ان کی حیثیت سے اغماض نہیں کرنا چاہئے اور اس واقعہ کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ انھوں نے یہ کارہائے نمایاں صرف اس وجہ سے انجام دیئے کہ وہ ہمہ تن اپنی قوم اور اپنے زمانے کے خیالات کا مرقع بن گئے، کوئی شخص اپنی قوم میں اس وقت تک حرکت نہیں پیدا کرسکتا، جب تک اس کے خیالات اس طرح متشکل نہ ہوجائیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی اصلی ضرورت کو مشخص کیا تھا، اور ان کو ہزاروں برس کی موروثی ظالمانہ غلامی سے نجات دلائی تھی، بدھ اور عیسیٰ نے بھی جب اپنے زمانے کی ظلم آرائیاں دیکھیں تو انھوں نے خدا کے لطف و محبت کو مذہبی صورت میں نمایاں

کیا اور درحقیقت اس وقت لوگ اسی ابر کرم کے پیاسے تھے' محمد ﷺ نے بھی ایک مذہبی اتحاد کے ذریعہ سے ان لوگوں میں یگانگت پیدا کی جو ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے' نپولین کے زمانے میں ایک قوم صرف جنگی غرور کے نشہ میں چور تھی' نپولین ان کے خیالات کا عملی پیکر بن گیا اور ان کو لے کر پندرہ برس تک یورپ کے گوشہ گوشہ میں صرف ان مقاصد کی تکمیل کے لئے دھاوے مارتا رہا' جن کو ایک قسم کا جنون کہا جاسکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اصول کا تشخص اور ان کی اشاعت صرف انہی رہنماؤں کا کام ہے' اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نوع انسان کا اصل الاصول خود یہی رہنما ہیں' ان اصول کو صرف اس وقت کامیابی حاصل ہوتی ہے' جب بھولے بھالے مومنین مخلصین کی ایک جماعت ان کی حمایت پر آمادہ ہوجاتی ہے' اس حمایت پر ان اصول کے صداقت و بطلان کا کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جو اصول جس قدر لغو و باطل ہوتا ہے اسی قدر لوگوں کو اپنا فریفتہ بناتا ہے یہاں تک کہ آج تک دنیا میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے' جس تمدن نے انحطاط کی صورت اختیار کی ہے' اور اس کی جگہ جس نئے تمدن نے لی ہے' وہ سب انہی غلط اصول کا نتیجہ تھے جن کے تصور سے بھی عقل کو شرم آتی ہے' اس بنا پر ضعیف العقل لوگوں کے لئے صرف آسانی ہی بادشاہت کا دروازہ نہیں کھلا ہوا ہے' جیسا کہ انجیل نے بار بار بشارت دی ہے بلکہ اگر یہ لوگ زلزلہ انگیز یقین رکھتے ہیں تو دنیوی سلطنت کا تاج بھی ان کے سر پر نظر آسکتا ہے' ان مومنین کی جماعت نے جس عمارت کو صرف "ایک دن میں" تعمیر کرلیا ہے' فلاسفہ ان کی بربادی میں عمریں بسر کردیا کرتے ہیں' لیکن بہتر ہوتا اگر وہ ان کے سامنے سربسجود ہوجاتے کیونکہ یہ لوگ قوائے مخفیہ کے اس سلسلہ کی ایک کڑی ہیں' جو دنیا کی پاسبانی کرتی ہے اور یہی لوگ ہیں جنہوں نے تاریخ کے عظیم الشان واقعات کو پیدا کیا ہے۔

یہ لوگ درحقیقت انسانوں کے لئے صرف اوہام و خیالات لے کر آئے' لیکن دنیا انہی اوہام باطلہ کے سہارے پر زندہ رہی' اور آئندہ بھی وہی اس کا

سرمایہ حیات ہوں گے' شاید یہ کہا جائے کہ ان خیالات کی کوئی حقیقت نہیں ہے' بے شبہہ وہ ایک خواب و خیال ہیں' لیکن بایں ہمہ ان کا احترام کرنا چاہئے' انہی کی برکت سے ہمارے آباؤ اجداو چاشنی امید سے لذت آشنا ہوئے' ان کے پیچھے پیچھے متوالوں کی طرح پڑلئے اور ہم کو قدیم وحشت سے نجات دلائی' اور موجودہ دور تک پہنچایا' اسی طرح ان اوہام نے تمدن پر بھی بہت بڑا اثر کیا ہے' وہم ہی نے اہرام مصری کی بنیاد ڈالی' اور پانچ ہزار برس تک مصر کے چہرے کو پتھر کی چٹانوں کی اندر مخفی رکھا' وہم ہی نے قرون وسطی میں ان تمام عظیم الشان گرجوں کا سنگ بنیاد رکھا' اور ایک قبر پر قبضہ (بیت المقدس) حاصل کرنے کے لئے تمام یورپ کو مشرق کی طرف جھونک دیا' وہم ہی نے ان مذاہب کو قائم کیا جن کی نصف دنیا پابند ہوگئی اور وہم ہی نے بڑے بڑے ملک آباد کیے اور بڑی بڑی سلطنتوں کا قلع قمع کردیا' الغرض دنیا نے جستجوئے حقیقت میں نہیں بلکہ صرف توہمات کے پیچھے کوششیں صرف کیں وہ اگرچہ ان اغراض وہمیہ کو حاصل نہ کرسکی' تاہم اس نے اس سفر میں ترقیوں کی تمام منزلیں طے کرلیں حالانکہ وہ اس کا اصلی مقصد نہ تھیں۔

حواشی

(۱) ہیئت جدیدہ کا بانی (۱۵۶۴'۱۶۴۲ء باشندہ اٹلی) ۔

(۲) اقلیدس و ہندسہ کا موجد۔

(۳) جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۷۰'۱۸۳۱ء)

پانچواں باب

نظام اخلاق کا انحطاط اور قوموں کا زوال

پہلی فصل

تمدن زوال پزیر ہو کر کیونکر فنا ہو جاتا ہے؟

انواع نفسیہ کا انحطاط' وہ موروثی قابلیت جو ایک زمانے میں پیدا ہوئی تھی' کیونکر چند دنوں میں معدوم ہو جاتی ہے' معراج کمال تک پہنچنے میں ہر قوم کو ایک طویل زمانے کی ضرورت ہوتی ہے' لیکن انحطاط کے تحت الثریٰ تک پہنچنے کے لئے ایک مختصر مدت کافی ہے' ہر قوم کے اسباب و انحطاط میں سب سے زیادہ موثر سبب اس کے نظام اخلاق کا انحطاط ہے' تمام قوموں میں تمدن کے انحطاط کا صرف ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ اب تک قائم ہے۔

بعض لیٹن قوموں میں انحطاط کی کھلی ہوئی علامتیں' خود غرضی کی نشوونما' ہمت اور ارادہ کا ضعف' اخلاق و آداب کا انحطاط' نوجوانان بدیذ' کسی زمانے میں اشتراکیت (سوشلزم) کا اثر بہت بڑھ جائے گا'

اشتراکیت کے خطرات اور اس کی قوت' اشتراکیت تمدن کو خالص وحشیانہ انقلاب کی طرف لے جاتی ہے' وہ قومیں جن میں اشتراکیت کی حمایت ہو سکتی ہے۔

انواع مادیہ کی طرح' انواع نفسیہ بھی ہمیشہ زندہ نہیں رہتیں' کیونکہ جن سباب نے ان کو پیدا کیا ہے' وہ خود ہمیشہ قائم نہیں رہتے' اس لئے جب ان حالات میں تغیر واقع ہوتا ہے' تو مزاج عقلی کے وہ عناصر بھی رفتہ رفتہ فنا ہو جاتے ہیں جو ان اسباب سے وابستہ و مربوط تھے' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نظام کائنات کا ایک عام فطری قانون ہے' جو جسم کی طرح' عقل کو بھی محیط ہے' اس قانون کا اقتضاء یہ ہے کہ ایک جسم کے پیدا کرنے کے لئے جس قدر زمانہ درکار ہے' اس کے فنا ہونے کے لئے اس سے بہت کم زمانہ کی ضرورت ہوتی ہے' کیونکہ جو عضو اپنے عمل کو چھوڑ دیتا ہے' اس کی عملی قابلیت اسی وقت معدوم ہو جاتی ہے' جو مچھلیاں سطح آب کے نیچے' پتھر کی چٹانوں میں رہتی ہیں' ان کی بصارت روز بروز ضعیف ہوتی جاتی ہے' یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد یہ ضعف موروثی ہو جاتا ہے' اگر ہم انسان کی محدود زندگی پر بھی نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہو گا کہ جو عضو متعدد وراثتوں کے اثر سے کئی پشت میں پیدا ہوا ہے' اگر اس سے کام نہ لیا جائے تو وہ فوراً" بیکار ہو جاتا ہے۔

مزاج عقلی بھی اس قدرتی قانون کے دائرہ سے باہر نہیں' اس لئے دماغ کے جو اجزاء اپنا عمل نہیں کرتے ان کی مخصوص قوت فاعلی بیکار ہو جاتی ہے' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دماغ کی بعض قابلیتیں جو ایک طویل زمانے میں پیدا ہوئی ہیں ایک محدود مدت میں زوال پذیر ہو سکتی ہیں' شجاعت' جرات' عزم و ارادہ' قوت استنباط' اور اس قسم کے دوسرے اخلاقی محاسن بہت دنوں میں پیدا ہوتے ہیں' اور جب اپنا محل استعمال نہیں پاتے تو نہایت سرعت کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کی ترقی کے لئے ایک طویل مدت کی ضرورت ہوتی ہے' لیکن اس کا تنزل نہایت سرعت کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگر ہم تاریخی حیثیت سے تمام قوموں کے تنزل پر نگاہ ڈالیں تو بلا استثناء ہر

قوم کے انحطاط کا اصلی سبب مزاج عقلی کا وہ تغیر ہوگا' جس کو صرف نظام اخلاق کی ابتری نے پیدا کیا ہے مجھ کو جہاں تک معلوم ہے' قوم میں ذہانت اور طباعی کی کمی کسی سلطنت کے زوال کا سبب نہیں ہوئی اس بنا پر تمدن کے زوال کا سبب صرف ایک ہی ہے' اور اس کو پیش نظر رکھنے کے بعد ایک شخص بعض شعراء کی طرح یہ سوال کرسکتا ہے کہ تاریخ جس نے بہت سے مجلدات کو بھردیا ہے' وہ بہت سے صفحات کے مجموعے کا نام ہے' یا حقیقت ہے۔ یہ صفحے مکرر ہیں؟

جب کوئی قوم تہذیب و تمدن کے زیور' اور نفوذ و قوت کے ہتھیار سے مسلح ہوجاتی ہے اور اس کو اپنی ہمسایہ قوم کے حملے کا خطرہ نہیں رہتا تو وہ نہایت عیش و طرب کے ساتھ جو دولت کا لازمی نتیجہ ہے' زندگی بسر کرنے لگتی ہے' اس لئے اس کے تمام فوجی محاسن برباد ہوجاتے ہیں' تمدنی ترق کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے' ہر شخص کے دل میں خود غرضی اپنا قدم جما لیتی ہے' اور اس کا مطمح نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے ہاتھ آئے' اس سے نہایت سرعت کے ساتھ ذاتی فائدہ اٹھائے' اس بنا پر تمام قوم عام مصالح سے اعراض کرنے لگتی ہے' اور قوم کے وہ تمام اخلاقی محاسن فنا ہوجاتے ہیں جو اس کی عظمت کا حقیقی سبب تھے' اب اس پر قرب و جوار کی وحشی یا نیم وحشی قوموں کا حملہ شروع ہوجاتا ہے' کیونکہ تمدنی حیثیت سے اگرچہ وہ اس کی ہمسری نہیں کرسکتیں' لیکن ان کا اعتقاد اس سے بہت زیادہ قوی ہوتا ہے' حملہ کرنے کے بعد وہ اس کی تمدن کی بنیاد کو ڈھا دیتی ہیں' اور اس کے کھنڈر پر دوسرے تمدن کی عمارت قائم کرتی ہیں' روم و ایران کی سلطنتوں کا یہی حشر ہوا' ان کا نظام حکومت اگرچہ نہایت مستحکم تھا تاہم بربرہ نے روم کا خاتمہ کردیا' اور عربوں نے ایران کے پرخچے اڑا دیئے' یہ بالکل یقینی ہے کہ ان مغلوب سلطنتوں میں عقل و ذہانت کی کمی نہ تھی' بلکہ ذہنی حیثیت سے فاتح کو مفتوح کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی' کیونکہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ عقل اور سب سے بڑی ذہانت کا ظہور روم ہی میں ہوا' اور شاہزادہ اول کے زمانے میں وہی روم کے زوال کا سبب بن گئی' اسی زمانے میں بڑے بڑے انشاء پرداز اور

بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے' اور اس شاندار قوم کے تمام کارنامہ ہائے زریں اسی زمانے کی طرف منسوب ہیں' لیکن اس زمانے میں اس نے اپنی اخلاقی طاقت کو کھودیا اور ذہانت کتنی ہی ترقی کرجائے' لیکن اخلاق کی قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

قدیم رومن لوگوں کی ضروریات زندگی بالکل محدود تھیں' اور ان کا اعتقاد نہایت قوی تھا' یہ اعتقاد تمام قوم کے رگ و پے میں سرایت کرگیا تھا' اور ہر شخص اس پر جان و مال بلکہ اپنے اہل و عیال تک کو قربان کردیتا تھا' یہی دونوں چیزیں روم کی عظمت کا حقیقی سبب تھیں' لیکن جب وہ مادی حیثیت سے تمام دنیا کا مرکز بن گیا' تو اس میں ہر طرف سے اجنبی قومیں آباد ہونے لگیں' جن کو اخیر میں "ملکی باشندوں" کا خطاب دے دیا گیا' حالانکہ ان کا مقصد صرف ملک کی شادابی سے فائدہ اٹھانا تھا' خود ملک کی عزت و اقتدار کی طرف ان کی توجہ نہ تھی' اب یہ عظیم الشان شہر اگرچہ تمام قوموں کا دنگل بن گیا' لیکن روم روم نہیں رہا' اس کے چہرے پر اگرچہ زندگی کی ظاہری علامتیں نظر آتی تھیں' لیکن درحقیقت اس نے مدتوں پہلے اپنی حقیقی روح کو نکال کر پھینک دیا تھا۔

بالکل اسی قسم کے متعدد اسباب ہمارے ترقی یافتہ تمدن کو بھی دھمکی دے رہے ہیں' اور جدید علمی تحقیقات نے خیالات میں جو تغیر پیدا کردیا ہے اور اس نے جو جدید اسباب پیدا کردیئے ہیں وہ ان پر مستزاد ہیں' علم نے ہمارے قدیم خیالات کو دوسرے قالب میں بدل دیا ہے اور تمدنی اور مذہبی اصول کے اثر کو صفحہ دل سے بالکل مٹا دیا ہے' انسان کی آنکھوں کے سامنے جو پردے پڑے ہوئے تھے' وہ اٹھ گئے ہیں اور اس کو معلوم ہوگیا ہے کہ عالم وجود میں اس کا کیا درجہ ہے؟ وہ اس سے بھی واقف ہوگیا ہے کہ خود فطرت کو اس درجہ کا احساس نہیں ہے' وہ یہ بھی جان گیا ہے کہ وہ جس چیز کو "آزادی" کے نام سے پکارتا تھا' وہ غلامی کے اسباب کی ناواقفیت کا نتیجہ تھی' ورنہ دنیا میں وہ ایک غلام ہے جو پنجہ تقدیر میں گرفتار ہے' اس کو یہ بھی یقین ہے کہ فطرت کی آغوش' لطف و محبت کے جذبات سے بالکل خالی ہے' اور انسان ترقی کے جن مدارج پر پہنچ گیا ہے' ان کو فطرت نے عناصر کے امتزاج و ترکیب سے پیدا کیا ہے' اور اس عمل

ترکیبی میں قوی عنصر نے ضعیف کی گردن توڑ دی ہے' یہ خیالات اس قدر موثر ہیں کہ ان کے اظہار سے لوگوں میں خون کا سیلان منجمد ہوجاتا ہے' اور جن عقائد کی بنا پر ہمارے آباؤ اجداد پرلطف زندگی بسر کرتے تھے' وہ ان کے یکسر مخالف ہیں' ان خیالات نے دلوں میں اضطراب انگیز شکوک پیدا کردیئے ہیں' اور ضعیف العقل لوگوں کو انارکزم کی مصیبت میں مبتلا کردیا ہے' جو اس زمانے میں سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہے' ان شکوک نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے نظام اخلاق میں عظیم الشان انقلاب پیدا کردیا ہے' اور ان کے دلوں میں یاس و حرمان کی تخم پاشی کی ہے' اس بنا پر ان کی قوت ارادی بالکل مفقود ہوگئی ہے' اور وہ وقتی اور ذاتی فوائد کے غلام بن گئے ہیں۔

موجودہ دور کے ایک انشاء پرداز کا یہ فقرہ کس قدر واقعیت پر مبنی ہے کہ "اس زمانے کی قوت ادراک پر اضافی خوبیوں نے تسلط کرلیا ہے" صیغہ تعلیم کے ایک وزیر نے اپنی ایک تازہ ترین تقریر میں اس کی شرح ان الفاظ میں کی ہے "اس زمانے کی علمی فتوحات میں سب سے بڑی فتح یہ ہے کہ کلی اصول کی جگہ اضافی اصول نے چھین لی ہے" لیکن درحقیقت اس فتح کا پتہ قدیم زمانے میں بھی چلتا ہے' چنانچہ آج سے دس صدی پیشتر فلاسفہ ہند کا بھی یہی حال تھا' آج یہ خیال دوبارہ زندہ ہوگیا ہے لیکن یہ ہمارے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں کیونکہ اصلی خطرہ ان عقائد کے عدم اذعان سے پیدا ہوتا ہے' جو قومی زندگی کے اصلی ستون تھے اور مجھے جہاں تک معلوم ہے' ابتداء تاریخ سے آج تک کوئی تمدن' کوئی نظام' کوئی عقیدہ اضافی اصول کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا' شاید یہ کہا جائے کہ بظاہر مستقبل سوشلسٹ گروہ کے ہاتھ میں نظر آتا ہے' لیکن اس کامیابی کی صرف یہ وجہ ہوسکتی ہے' کہ جو لوگ ان کے مذہب کی منادی کرتے ہیں' ان کا دعوی ہے کہ یہ مذہب حقائق کلیہ پر مشتمل ہے' اور جماعت صرف ان ہی لوگوں کے حلقہ اثر میں آتی ہے جو حقائق کلیہ کو دعوت دیتے ہیں' ان کے سوا وہ اور لوگوں کی طرف رخ نہیں کرتی' اگر کوئی شخص پالیٹیشن بننا چاہتا ہے تو اس کو سب سے پہلے جماعت کی روح کا سراغ لگانا چاہئے' اس کے خلاف کی حقیقت سے واقف

ہونا چاہئے' اور فلسفیانہ موشگافیوں کو پس پشت ڈال دینا چاہئے' کیونکہ اشیاء کی حقیقت میں بہت کم تغیر ہوتا ہے' صرف ان کی صورتیں بدلتی ہیں' اور ہوشیار صرف وہ شخص ہے جو ان ظاہری صورتوں سے کام لیتا ہے"۔

یہ سچ ہے کہ ہم کو صرف عالم کون کی ظاہری حقیقت کا علم ہو سکتا ہے' یعنی صرف وہ نفسی حالات معلوم ہوسکتے ہیں جن کی قدر و قیمت بالکل اضافی ہے' لیکن بایں ہمہ اجتماعی حالات کے لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے' کہ ہر زمانہ' اور ہر قوم کے حالات' رسوم' اور نظام' کلی حیثیت رکھتے ہیں' اور کوئی قوم ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی' اگر ان کلیات میں شکوک پیدا ہوجائیں تو یقین کرلینا چاہئے کہ اس قوم کے آخری دن آگئے۔

ان حقائق کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ کوئی علم ان سے انکار نہیں کرتا' البتہ ان کے مخالف مذاہب کا اثبات سخت خطرناک ہے' بالخصوص وہ سلبی فلسفہ' جس کی نسبت بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ وہ دیرپا زندگی حاصل کرے گا لوگوں کے دل میں عقیدہ قائم کر رہا ہے کہ موجودہ نظام بالکل ظالمانہ ہے اس میں کہیں رحم کی جھلک نظر نہیں آتی اور انسانوں کی مختلف فطری طبقے ایک مضحکہ خیز ظرافت ہیں اس بنا پر وہ لوگوں کو ہر چیز کا دشمن بنا دیتا ہے' اور ان کو اشتراکیت اور فوضویت (۱) کی طرف مائل کرتا ہے' اس زمانے کے سیاست دان اگرچہ نظام حکومت کے اثر کا دل سے اعتراف کرتے ہیں' لیکن اصول کے متعلق ان کا اعتقاد بھی نہایت ضعیف ہے' حالانکہ علمی تحقیقات سے ثابت ہوگیا ہے کہ ہر نظام اصول ہی سے متفرع ہوتا ہے' اور جب تک مقدمات کا وجود نہ ہو نتیجہ کا وجود نہیں ہوسکتا' اصول درحقیقت کائنات کے اندرونی اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے اگر وہ فنا ہوجائیں' تو تمدن اور نظام حکومت کی تمام مخفی بنیادیں متزلزل ہوجائیں' اس لحاظ سے قوموں کے ابتلا" و امتحان کا سخت ترین زمانہ وہ ہوتا ہے جب اصول اور عقائد ساتھ ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کردیئے جاتے ہیں۔

اگر ہم مقدمات سے نتائج کا استنباط کریں تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ

یورپ کی تمام بڑی بڑی قوموں میں انحطاط کی علامتیں علانیہ ظاہر ہو رہی ہیں' بالخصوص لیٹن قوموں میں انحطاط شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہا ہے' یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انحطاط اس کی موروثی اور قومی خصوصیات کا نتیجہ ہے' یا اس کو تعلیم و تربیت' اور تقلید نے پیدا کیا ہے' تاہم یہ بدیہی ہے کہ وہ روز بروز ہمت' ارادہ' علمی قابلیت' اور قوت استنباط کو کھوتی جاتی ہے اور عنقریب وہ صرف مادی ضروریات پر قانع ہو کر بیٹھ رہے گی حالانکہ ان میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے اور نسل کی ترقی میں کمی ہوتی جاتی ہے' اجتماعی قوت پراگندہ ہو رہی ہے' فقراء سے لے کر بڑے بڑے امراء تک غصہ اور تنگ دلی کی عام مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں' اور اس زمانے میں انسان بالکل اس جہاز کے مشابہ ہوگیا ہے جس کا کپتان ڈوب گیا ہے' اور وہ تن بہ تقدیر ہوا کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہا ہے' جدید علوم و فنون نے اس گوشہ فراغت کو جس میں معبودون کی بھرمار رہتی تھی بالکل چٹیل میدان بنادیا ہے' اس لئے انسان نے خدا کو چھوڑ کر اپنے سر رشتہ امید کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے' جماعت میں انفعالی قوت بڑھ گئی ہے' اور وہ ہر چیز سے شدت کے ساتھ متاثر' اور اس لئے نہایت سرعت کے ساتھ تغیر پذیر ہو رہی ہے' اس کے آگے کوئی دیوار نہیں ہے جو اس کی بے راہ روی کو روک سکے' اس لئے وہ سیلاب کی طرح فوضویت کے جنون سے استبداد کی ذلت کی طرف متصل حرکت کر رہی ہے' صرف "کچھ کہہ دینا" اس کو برا نگیختہ کردیتا ہے وہ ہر روز ایک نیا خدا بناتی ہے' صبح کو اس کے آگے سجدہ کرتی ہے' اور شام کو اس کو فنا کردیتی ہے' عام خیال ہے کہ وہ یہ جدوجہد آزادی کے لئے کر رہی ہے' لیکن درحقیقت وہ آزادی کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے' اور حکومت سے درخواست کر رہی ہے' کہ اس کے گلے میں طوق و زنجیر ڈال دے' وہ اپنی حقیر جماعت' اور فلسفیانہ حیثیت سے نہایت استبداد پسند خامیوں کی اندھا دھند اطاعت کرتی ہے' جو لوگ اس کی رہنمائی کا دعوی کرتے ہیں' وہ درحقیقت اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں وہ ان لوگوں میں جو دماغی اضطراب کی بنا پر ہر روز نئے نئے لیڈروں کی اطاعت کرتے ہیں' اور اس روح

استقلال میں جو ہر لیڈر کی ذلیل اطاعت سے اباء کرتی ہے' تفریق و امتیاز نہیں کرتے حکومت کسی قسم کی ہو لیکن درحقیقت وہ ہر گروہ کا قبلہ مقصود ہے' اور تمام لوگ اس سے ایک نئی بندش کی درخواست کرتے ہیں' اور اس سے ایسی اعانت کے خواستگار ہوتے ہیں' جو انسان کی گردن پر نہایت وزنی بوجھ لاد دیتی ہے' یعنی لوگ چاہتے ہیں کہ قوم کے تمام چھوٹے بڑے کام نظام حکومت کے سخت اور استبدادانہ سلسلے میں جکڑ دیئے جائیں' اور ہمارے نوجوان روز بروز ان کاموں سے اعراض کرتے جاتے ہیں' جن میں قوت استنباط ذاتی جدوجہد' عقل' ہمت' اور ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے' وہ چھوٹی سے چھوٹی ذمہ داری سے گھبراتے ہیں اور ذلیل سرکاری ملازمتوں کی جائے پناہ میں چھپنا چاہتے ہیں' تاجروں کو نو آبادیوں کے قائم کرنے کا طریقہ معلوم نہیں ہے' اس لئے نو آبادیوں میں صرف ملازمت پیشہ لوگ رہتے ہیں' (۲) لیکن ان میں اور عام جماعت میں کوئی فرق نہیں ہے' جس طرح جماعت نے اپنی ہمت اور قوت عمل کو حملہ آورانہ جوش اور غیظ و غضب سے بدل دیا ہے' اسی طرح ان لوگوں نے بھی ان اخلاقی اوصاف کو شخصی جھگڑوں کی صورت میں نمایاں کیا ہے' طلباء میں ان محاسن کی جگہ ایک ایسے احساس نے لے لی ہے' جس کا دامن عجز و درماندگی کے آنسو سے تر رہتا ہے' اور اس کے مرقع میں حقائق اشیاء کی صورتیں گڈمڈ ہو گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہایت دھیمی آواز سے اپنی بدبختی کا رونا رو رہے ہیں' اور انتہائی خود غرضی کا دور دورہ ہے' اور جس قوم کا یہ حال ہے اس کے افراد کا مقصد خود غرضی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وہ موقع ہے جہاں انسانی ضمیر سپر ڈال دیتا ہے' اخلاق قدیمہ میں انحطاط کے بعد تدریجی زوال آجاتا ہے (۳) آدمی میں اپنے اوپر حکومت کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہتی' اس لئے وہ اپنے جذبات کو روک نہیں سکتا' اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے اوپر حکومت نہیں کر سکتا' اس پر کوئی دوسرا حکومت کرے گا۔

اس حالت کا بدلنا سخت مشکل کام ہے' کیونکہ سب سے پہلے ہمیں اس افسوسناک لیٹن طریقہ تربیت کو بدلنا پڑے گا' جو ہم کو قوت استنباط اور ہمت سے

(اگر ہم میں وراثتاً" یہ جوہر موجود ہیں) معرا کرکے ہمارے ملکہ استقلال عقلی کو بالکل فنا کردیتا ہے، کیونکہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ امتحانات میں کوئی سبقت لے جائیں، اور یہ ایک ایسا بدترین مقصد ہے جس میں صرف قوت حافظہ سے کام لینا پڑتا ہے، اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ تمام قومی کاموں کو صرف وہ لوگ انجام دیتے ہیں، جن میں تقلید کے سوا اور کوئی قابلیت نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ان کاموں کو بہت کم ہاتھ لگاتے ہیں، جن میں ذاتی ہمت اور بیباکانہ جرات کی ضرورت ہوتی ہے، ایک بار گیزو نے انگریزی مدارس کا معائنہ کیا تو اس سے بعض پروفیسروں نے کہا

"میں طلباء کی روح کے اندر لوہا پگھلا کے ڈالنا چاہتا ہوں"

کیا لیٹن قوموں میں بھی ایسے پروفیسر، اور ایسا نظام تعلیم موجود ہے، جو ایسا اعلیٰ خیال پیدا کرسکتا ہے؟ شاید نظام فوجی اس کی مثال پیش کرسکے گا، بہرحال ہمارے یہاں صرف یہی طریقہ اس کا ذریعہ ہے، اس بنا پر تنزل پذیر قوموں کے ابھارنے کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ ان میں فوجی نظام کو عام طور پر وسعت دی جائے، ان کو سنگدل بنایا جائے اور ان کو ہمیشہ چکنا چور کردینے والی لڑائیوں کی دھمکی دی جائے۔

لیٹن قومیں ان آزاد قوانین کے زیر سایہ نہایت سخت زندگی بسر کررہی ہیں، جو استبداد اور فوضویت دونوں سے الگ ہیں، یہ دشواریاں صرف اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ قوم کا نظام اخلاق پست ہوگیا ہے، قوم کے افراد میں ضبط نفس کی قوت نہیں ہے، لوگ فوائد عامہ سے منحرف ہوکر خود غرضی کی طرف مائل ہوگئے ہیں، اگر قومی جماعت ان قوانین کو پسند نہیں کرتی تو غور کرنے سے اس کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے، کیونکہ ہر جماعت بالطبع شاہانہ حکومت چاہتی ہے، تاکہ اس کو فاتحانہ مساوات حاصل ہوجائے وہ آزادی کی خواستگار نہیں ہوتی جو فاتحانہ اختیارات ہی کو سلب کردیتی ہے، البتہ یہ عقدہ مشکل سے حل ہوسکتا ہے کہ خود روشن ضمیر طبقہ اس آزاد نظام حکومت سے کیوں نفرت کرتا ہے؟ شاید ہم کو یہ نفرت اپنے آباؤاجداد کی وراثت میں ملی ہے حالانکہ ہر قسم کی مہارت،

بالخصوص عقلی ترقی کی بلند پروازی کے لئے اس نظام حکومت سے زیادہ صاف کوئی فضا نہیں مل سکتی' یہاں تک کہ جو لوگ مساوات کے خواستگار ہیں ان کے نزدیک اس نظام حکومت کا سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ وہ ان فرقوں کے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' جو عظیم الشان عقلی طاقت کے بل پر امتیاز عام حاصل کرلیتے ہیں' لیکن شاہانہ نظام (۴) حکومت کسی قسم کا ہو وہ عقل اور اخلاق دونوں کو برباد کردیتا ہے' اس میں صرف یہ خوبی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو ذلت اور دناء ت میں یکساں طور پر شریک کرلیتا ہے' اور اس لئے وہ تنزل پذیر قوموں کے لئے نہایت موزوں ہے' اور اس لئے وہ جب موقع پاتی ہیں' اس کی طرف رخ کرتی ہیں اور لیڈرون کی زرق برق پوشاک ان کو اسی غار میں جھونک دیتی ہے' جب قوم اس درجہ انحطاط کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے زوال کی تاریخ شروع ہوجاتی ہے۔

تاریخی حیثیت سے شاہانہ حکومت کا زمانہ یا تو تمدن کے شباب کی حالت میں شروع ہوتا ہے یا اسکی بنیاد تمدنی انحطاط کے دور میں پڑتی ہے' آج بھی خودمختارانہ طرز حکومت ایک دوسرے قالب میں جلوہ گر ہوا ہے' یعنی اس کا ظہور اشتراکیت کی صورت میں ہورہا ہے' اشتراکیت درحقیقت افراد کو فنا فی السلطنت کردیتی ہے' بلکہ وہ شاہانہ طرز حکومت سے بھی زیادہ خطرناک ہے' کیونکہ ایک بڑے سے بڑا استبداد پسند بادشاہ بھی انجام کار سے ڈرتا ہے' لیکن جماعتی حکومت کو اس کا ذرہ برابر بھی خوف نہیں ہوتا اس زمانہ میں اشتراکیت تمام خطرات سے زیادہ یورپین قوموں کی ہستی کو دھمکی دے رہی ہے قوم پر دوسرے موثرات اثر کرچکے ہیں اور اب وہ ان کے تنزل کا سامان کررہی ہے اور اس کے ذریعہ سے یورپین تہذیب کا خاتمہ ہوگا۔

اس کے خطرات اور اس کے اثرات کا اندازہ صرف اس سے ہوسکتا ہے' کہ لوگ اس شدت کے ساتھ اس کی طرف مائل ہورہے ہیں کہ خود اس تعلیم کو چھوڑتے جاتے ہیں' جس نے اشتراکیت کو پیدا کیا ہے' جو لوگ زندگی کے مصائب میں مبتلا ہیں اور اس زمانہ کے تمدن نے جب مالی مشکلات پیدا کردی

ہیں، ان سے واقف ہیں، وہ اس مذہب جدید کو علانیہ قبول کررہے ہیں، ان لوگوں کی تعداد اگرچہ اب بھی غیر محدود ہے، لیکن چند ہی دنوں میں آسمانوں کی وسیع فضاء بھی اس سے بھر جائے گی، جو لوگ مصائب زندگی کو برداشت نہیں کرسکتے، ان کو وہ جنت کی صورت میں نظر آئے گی، یعنی وہ جنت جو پہلے صرف مسجدوں اور گرجوں کے جھروکوں سے نظر آتی تھی، اس آنے والے مذہب کے شیدائی بڑھتے جاتے ہیں، اور عنقریب اس پر قربانیاں چڑہائی جائیں گی، اور اس حالت میں وہ ایک مذہبی عقیدہ ہوجائے گی جس کی آواز سے تمام قوم لرز اٹھتی ہے۔

یہ خیال کہ اشتراکیت انسان کو غلامی کے پست ترین درجہ کی طرف لے جاتی ہے اور ہمت و استقلال کو فنا کرڈالتی ہے، ایک ایسا خیال ہے جس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اس سے صرف علم النفس کے ماہر ہی واقف ہیں اور وہ جماعت کے دماغ میں بھی نہیں آسکتا کیونکہ وہ اس قسم کے دلائل کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کو جن دلائل سے تسکین ہو سکتی ہے، ان کا اثبات عقلی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔

اگرچہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو شخص ذرہ برابر بھی ذوق سلیم رکھتا ہے وہ اس مذہب کو قبول نہیں کر سکتا، تاہم جو مذاہب ایک طویل زمانے تک ہم پر فرمانروائی کرتے رہے ہیں وہ بھی ذوق سلیم کے لئے قابل انکار تھے، عقلاء کے گروہ نے ان مذاہب کے قبول کرنے سے صرف اس بنا پر انکار کیا کہ انسان مذہبی عقائد کو صرف غیر شاعرانہ طور پر قبول کرتا ہے اور غیر شاعرانہ احساسات کے دائرہ عمل میں عقل کی رسائی نہیں ہوتی۔

اس بنا پر اشتراکیت کے خطرات کتنے ہی عام ہو جائیں لیکن یورپین قوموں کو اس کے سامنے سر بسجود ہونا ہی پڑے گا اور اس پر ان کو موجودہ زمانے کا مزاج عقلی مجبور کرے گا اور اس طور پر وہ انحطاط کے انتہائی درجہ تک پہنچ جائے گی، کیونکہ زمانہ تمدن کو تحت الثریٰ میں لے جا رہا ہے اور بربر کی خانہ برانداز غارتگری کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے۔

اگر روسی قوم کو جو نفسی حیثیت سے بہ نسبت یورپین قوموں کے ایشائی قوموں سے زیادہ مشابہ ہے، مستثنیٰ کر لیا جائے، تو انگریزوں کے سوا کسی یورپین قوم میں وہ عزم وہ ارادہ، وہ مستحکم عقیدہ اور وہ استقلال نہیں پایا جاتا جو اس جدید مذہب کے حملہ سے اس کو محفوظ رکھ سکے اس وقت نوخیز جرمنی کے چہرے پر اگرچہ ترقی کے خدوخال نظر آ رہے ہیں، لیکن وہ سب سے پہلے اشتراکیت کا شکار ہو گی، کیونکہ اس کے تمام اطراف میں سوشیالسٹوں کو کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں، یہ مسلم ہے کہ جو اشتراکیت جرمنی کو تباہ کرے گی، عنقریب اس کا ظہور ایک علمی لباس میں ہو گا، مگر یہ لباس صرف اس خیالی پلاؤ پکانے والی قوم کے لئے موزوں ہو سکتا ہے جو نوع انسان میں زندگی بسر نہیں کر سکتی، لیکن آخر میں جو عقلی نتیجہ پیدا ہو گا، وہ گذشتہ نتائج سے زیادہ سخت اور قوی ہو گا، جرمنی تمام قوموں سے زیادہ اشتراکیت کے قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے کیونکہ استقلال اور اسباط نتائج کا ملکہ اس سے رخصت ہو چکا ہے اور اپنے اوپر حکومت کرنے کی عادت اس سے مفارقت کر چکی ہے (۵) روس میں آج سے چند دنوں پہلے وہ اشتراکی نظام قائم تھا جو وہ وحشی اور سادہ قوموں میں عام طور پر رائج ہے، اور اشتراکیت کی مکمل صورت اسی نظام کے پردے میں جلوہ گر ہوتی ہے آج بھی اگرچہ وہ کلیتہً اس سے آزاد نہیں ہے لیکن اب وہ اس تنزل پذیر حالت کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اس لئے اس کا مستقبل تمام قوموں سے مختلف ہو گا کیونکہ اقتصادی لڑائیوں کے بعد اشتراکیت وحشی قوموں کے لئے راستہ صاف کر دے گی، اور ٹوٹ ٹوٹ کر یورپین قوموں پر گرے گی اور ان کے تمدن کو نگل جائے گی۔

لیکن یہ زمانہ اب تک نہیں آیا ہے اور ابھی اس کے آنے میں کسی قدر دیر ہے، اس کے علاوہ اشتراکیت میں جو ظالمانہ بے اعتدالی پائی جاتی ہے وہ اس کو قائم نہیں رہنے دے گی اور اس وقت لوگوں کو تبیر اور کالیگولا (۶) کے زمانے پر رحم آئے گا، ہم کو تعجب ہے کہ رومانیوں نے کیونکر ان ظالموں کے مظالم برداشت کئے، لیکن یہ تعجب اس وقت زائل ہو جاتا ہے جب ہم کو یہ معلوم

ہوتا ہے کہ ان پر خانہ جنگیوں کے متعدد دور گزر چکے تھے' اور جلا وطنی نے ان کو اس قدر مایوس کر دیا کہ ان کی اخلاقی طاقت سلب ہو چکی تھی' اس لئے انھوں نے انہی ظالموں کو اپنی نجات کا وسیلہ بنایا اور ان کے تمام مظالم برداشت کئے' کیونکہ ان کو یہ معلوم ہی نہی تھا کہ وہ اپنی ذات کے سوا ان کو کیا معاوضہ دے سکتے ہیں ؟اور درحقیقت مٹ جانے کے بعد رومانیوں کو ان کا بدل بھی نہ مل سکا بلکہ بربر کا سیلاب ان کو اور ان کے ساتھ ان کے تمدن کو بھی بہا لے گیا۔الغرض رومن سلطنت کا یہ افسوسناک انجام ہوا اور اس زمانے میں بھی تاریخ کا یہ دور عود کرنے والا ہے۔

حواشی

(۱) انار کزم۔

(۲) اس موقع پر موسیوٹین ممبر صیغہ نو آبادیات کی اس اسپیچ کا ایک ٹکڑا درج کردینا مناسب ہوگا جو انھوں نے پارلیمنٹ میں ۷ نومبر ۱۸۹۰ء میں دی تھی اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ "کوچن چین کی کل آبادی ۱۸۰۰۰۰ ہے جن میں ۱۶۰۰ فرنچ ہیں' ان میں ۱۲۰۰ سرکاری ملازم ہیں' یہ ملک ایک مجلس کے زیر حکومت ہے جس کے ممبروں کا انتخاب خود یہی ملازمت پیشہ لوگ کرتے ہیں' اور پارلیمنٹ میں اس کا ایک قائم مقام رہتا ہے' پھر کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان ممالک میں انارکزم کی اشاعت نہ ہوگی؟ (مختلف مقامات سے ہنسی اور شور) کیا آپ لوگوں کو اس طریقہ انتظام کا نتیجہ معلوم نہیں ہے؟ اس کا یہ نتیجہ ہے' کہ بجٹ کی ۲۲ ملین کی میزان میں سے نو ملین صرف دفاتر نگل جاتے ہیں' میں نے ۱۸۷۷ء میں ملازمتوں کو کم کرنا چاہا تھا' اس لئے بجٹ میں ۵۰۰۰۰۰ ۳ فرنک کی کمی کردی تھی' اکتوبر میں یہ کارروائی عمل میں آئی اور سوء اتفاق سے دسمبر میں وہ وزارت ٹوٹ گئی جس کا میں ممبر تھا اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں نے جن لوگوں کو ملازمت سے علیحدہ کردیا تھا وہ مارچ میں اپنی اپنی جگہ پر پھر واپس آگئے"

(۳) بعض مخصوص فرقوں کا اخلاقی تنزل اور بھی زیادہ خطرناک ہے مثلاً" بنکوں کے ٹرسٹی جو زمانہ قدیم میں نہایت متدین ہوتے تھے اس زمانے میں ان کا اخلاقی انحطاط اپنے انتہائی درجہ کو پہنچ گیا ہے' سرکاری رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ۱۰۰۰۰ ہزار ٹرسٹیوں میں

۴۳ پر فرد قرارداد جرم لگائی حالانکہ اس تعداد میں پوری قوم کی نسبت ایک شخص سے زیادہ نہ تھی' میں نے ایک سرکاری اخبار میں جو ۳۱ جنوری' ۱۸۹۰ء کو شائع ہوا تھا وزیر عدالت کی ایک یادداشت پڑھی تھی جو انھوں نے پریسیڈنٹ کی خدمت میں بھیجی تھی' اس میں وہ فرماتے ہیں "۱۸۴۰ء سے ان مصائب میں اور اضافہ ہوگیا ہے' جنھوں نے قوم کو پریشان کرر کھا ہے' یہاں تک کہ ایک مہاجن کو ۱۸۷۶ء میں نیابت کو ٹرسیٹوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا پڑی' کیونکہ اس وقت جو مصیبتیں نازل ہورہی تھیں انھوں نے ایک ایسی خوفناک صورت اختیار کرلی تھی جو پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی' کیونکہ اس قسم کے افسوسناک واقعات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا ۱۸۸۶ میں ان واقعات کی تعداد ۳ تھی ۱۸۸۳ میں ۴۱ ہوگئی ۱۸۸۴ میں ۵۴ تک پہنچ گئی اور ۱۸۸۶ء میں اس کی تعداد ۷۱ ہوگئی' ان ٹرسٹیوں نے ۱۸۸۰ اور ۱۸۸۶ کے درمیان میں جس قدر خیانتیں کیں ان کی تعداد ۶۲ ملین تھی ۔ ۱۸۸۹ میں ۱۰۳ ٹرسٹیوں کو ان کے عہدے سے علیحدہ کردیا گیا ان کو استعفاء پر مجبور کیا گیا اور اگر ہم ان واقعات کے ساتھ عظیم الشان مالیتوں یعنی بنکوں کی تحریکات کی ناکامیابی کا اضافہ کریں تو ہم کو اقرار کرنا پڑے گا کہ سوشلسٹ گروہ احکام کی اخلاقی حالت کا شاکی ہے تو اس کو معذور رکھنا چاہئے' سب سے زیادہ بدقسمتی یہ ہے کہ اخلاقی تنزل تمام لیٹن قوموں میں عام طور پر پایا جاتا ہے' اٹلی کے سرکاری بنک کے شرمناک واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلی عہدہ داران حکومت بے شمار روپیہ کی چوری کرتے تھے' پرتگال کے افلاس' اسپین کی نازک مالی حالت' اور امریکہ کی لیٹن جمہوریت کے تنزل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے بعض گروہوں میں لاعلاج مرض پھیل گیا ہے اور یہ حالت اس کے تنزل کا پیش خیمہ ہے"

(۴) یعنی شخصی نظام حکومت

(۵) جرمنی کے مشہور انشاء پرداز بھی ہماری رائے کی تائید کررہے ہیں' اسٹربرگ یونیورسٹی کے پروفیسر موسیو ریجلر اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں "جبکہ انگریزی قوم خود اپنے اوپر حکومت کرنا چاہتی ہے ہماری قوم کی امتیازی خصوصیت تمام تر حکومت کے اعتماد پر زندہ رہنا ہے' ہم ایک ایسی قوم ہیں جو مدت سے وصیتوں پر زندگی بسر کررہی ہے' بسمارک کے مضبوط ہاتھ نے گزشتہ ۲۰ سال کے زمانے میں ہم سے ملکہ استنباط' اور عاقبت

اندیشی کو چھین لیا ہے' گو اس کے عوض میں ہمارے لئے ایک مامن بنا دیا ہے' یہی وجہ ہے کہ ہم تمام چھوٹے بڑے معاملات میں حکومت کا دامن پکڑتے ہیں' اور اس پر ہر چیز کو چھوڑ دیتے ہیں"

(۶) روم کا ایک نہایت ظالم اور شہوت پرست بادشاہ ۱۲ء ۔ ۴۱ بالآخر رعایا نے تنگ آکر اس کو قتل کر ڈالا۔

دوسری فصل

خلاصہ عامہ

ہم نے اس کتاب کے مقدمہ میں بتادیا ہے' کہ قوموں کی تمدنی تاریخ پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے یہ کتاب اس کا خلاصہ ہے' اس لحاظ سے اس کی ہر فصل کسی گزشتہ تصنیف کا ملخص ہے اور اس لئے اس خلاصہ کا خلاصہ کرنا نہایت مشکل ہے' تاہم ناظرین کے تنگی وقت کے لحاظ سے ہم اس مشکل کام کو بھی اپنے سر لیتے ہیں' اور اس کتاب کے اساسی فلسفیانہ اصول کو مختصر مقدمات کی صورت میں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں' چنانچہ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) خواص جسمانی کی طرح' ہر قوم چند نفسی خواص بھی رکھتی ہے' اور انواع نفسیہ مادیہ کی طرح' پشتوں اور مدتوں کے بعد بدلتی ہیں۔

(۲) ان نفسی موروثی خواص کے مقابل میں ہر قوم میں دوسرے خواص بھی پائے جاتے ہیں' جو آب و ہوا' اور گرد و پیش کے حالات سے پیدا ہوتے ہیں' اور ان میں ہمیشہ تجدد و تغیر ہوتا رہتا ہے' اس لئے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قوم میں ایک عظیم الشان دائمی انقلاب ہو رہا ہے۔

(۳) خواص نفسیہ کے مجموعہ سے ہر قوم میں ایک مزاج عقلی پیدا ہو جاتا ہے' جو اس کے زندہ افراد اور گزشتہ اسلاف کا خلاصہ ہوتا ہے' لیکن قوموں کی زندگی میں زندہ افراد کے بجائے نمایاں حصہ مردوں کا ہوتا ہے' کیونکہ انہی مردہ روحوں نے ان میں اخلاقی احساس پیدا کیا ہے' اور اس کی رفتار ترقی کے اسباب فراہم کئے ہیں۔

(۴) نوعی امتیازات کے ساتھ قومیں دوسرے اوصاف کے لحاظ سے بھی باہم ممتاز ہوتی ہیں اور ان اوصاف اور نوعی امتیازات میں باہم تلازم ہوتا ہے' لیکن اگر دو قوموں سے متوسط طبقے کے افراد لئے جائیں' تو ان میں یہ فرق کم اور اعلیٰ طبقہ کے افراد میں زیادہ نظر آئے گا' اور اس میں موازنہ سے ثابت ہو گا کہ متمدن اور غیر متمدن قوموں میں صرف یہ فرق ہے' کہ متمدن قوم بہت سے روشن دماغ اور صاحب عقل افراد پر مشتمل ہوتی ہے' اور غیر متمدن قوموں میں ان افراد کا وجود نہیں پایا جاتا۔

(۵) غیر متمدن قوموں کے افراد میں نہایت واضح طور پر مساوات پائی جاتی ہے' لیکن قوم جس قدر تمدنی حیثیت سے ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر اس میں باہم فرق و امتیاز پیدا ہوتا جاتا ہے' اس لیے تمدن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اقوام و افراد میں باہم امتیاز پیدا کر دیتا ہے' اس طرح وہ مساوات کے بجائے فرق مراتب قائم کرتا ہے۔

(۶) قومی زندگی' اور تمدن کے تمام مظاہر قومی روح کا آئینہ ہوتے ہیں' جو اگرچہ ایک نہایت مخفی شے کے عکس کو نمایاں کرتا ہے' تاہم اس کے وجود میں کسی قسم کا شبہہ نہیں ہو سکتا اس لئے خارجی واقعات' ایک مخفی قوت فاعلی کا پرتو ہوتے ہیں۔

(۷) قومی زندگی کی بنیاد صرف اتفاق وقت' خارجی حالات' اور نظام حکومت پر قائم نہیں ہوتی' بلکہ ہر قوم کے نظام اخلاق پر ہوتی ہے۔

(۸) چونکہ ہر قوم کے تمدنی عناصر اس کے مزاج عقلی کی دلیل ہوتے ہیں' یعنی ان کے ذریعہ سے قوم کے احساس و شعور کی مخصوص کیفیت ظاہر ہوتی ہے' اس لئے جب تک کسی دوسری قوم میں کوئی تغیر نہ پیدا ہو جائے' ان عناصر کو اس میں منتقل نہیں کیا جا سکتا البتہ ان کی سطح اور ظاہری صورت کو منتقل کر سکتے ہیں' لیکن وہ درحقیقت کوئی قابل اعتداد چیز نہیں۔

(۹) مزاج عقلی کے اختلاف کی بنا پر ہر قوم حقائق اشیاء کا تصور مختلف صورتوں میں کرتی ہے اس لئے ہر قوم حس' عقل اور عمل میں دوسرے سے

مختلف ہوتی ہے' اور جب ان میں باہم کش مکش ہوتی ہے' تو تمام مسائل کے متعلق ایک عام نزاع قائم ہوجاتی ہے' اور یہی نزاع تاریخی لڑائیوں کا سبب بن جاتی ہے' اس لحاظ سے درحقیقت فاتحانہ لڑائیاں' مذہبی لڑائیاں' اور خاندان شاہی کی لڑائیاں' کل کی کل قومی لڑائیاں ہیں۔

(۱۰) مختلف الاصل افراد کے مجموعہ سے کوئی مستقل قوم نہیں بن سکتی' یعنی ان میں کوئی مشترکہ قومی روح نہیں پیدا ہوسکتی' البتہ ایک زمانہ دراز کے بعد جب کہ ان کی نسل میں اختلاط ہوجاتا ہے' ایک ہی آب و ہوا میں ان کو متحدہ طرز معاشرت کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوتا ہے' اور ان کے احساسات' فوائد' اور عقائد متحد ہوجاتے ہیں' تو اس قسم کی روح پیدا ہوجاتی ہے۔

(۱۱) متمدن قوموں میں اصلی (یعنی فطرتی) قومیت کا وجود نہیں پایا جاتا' بالکہ ان کی قومیت' بالکل مصنوعی ہوتی ہے' جو تاریخی حالات سے پیدا ہوجاتی ہے۔

(۱۲) آب و ہوا اور گرد و پیش کے حالات کا اثر صرف جدید قوموں پر پڑتا ہے' یعنی ان سے صرف وہ قومیں متاثر ہوتی ہیں جن کا موروثی نظام اخلاق مختلف قوموں کے اختلاط اور باہمی توالد و تناسل سے درہم برہم ہوجاتا ہے' اس لئے وراثت کو صرف وراثت ہی فنا کرسکتی ہے لیکن اگر کسی قوم کا نظام اخلاق اس قدر مستحکم بنیاد پر قائم ہو کہ یہ چیزیں اس کو جنبش نہ دے سکیں تو آب و ہوا کے تغیرات کا اثر اس کے درہم برہم کرنے میں بہت کم کامیاب ہوگا' بلکہ بعض اوقات قدیم قومیں بالکل فنا ہوجاتی ہیں' لیکن ان میں آب و ہوا کا اثر کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کرسکتا۔

(۱۳) ہر قوم اسی وقت ترقی کے معراج کمال پر پہنچ سکتی ہے' جب اس کی متحدہ روح کا خمیر کامل طور پر پختہ ہوجائے' لیکن جب اس روح کا شیرازہ بکھر جاتا ہے' تو اس قوم پر زوال آجاتا ہے' اور اس روح کے فنا کرنے کا سب سے زیادہ موثر سبب قوم میں اجنبی عنصر کا داخل ہونا ہے۔

(۱۴) انواع نفسیہ' انواع مادیہ کی طرح زمانے کے اثر سے متاثر ہوکر بوڑھی ہوتی ہیں' اور پھر مرجاتی ہیں' ان کی تولید میں اگرچہ ایک طویل زمانہ

صرف ہوتا ہے، لیکن ان کے زوال کے لئے ایک نہایت مختصر اور محدود مدت درکار ہوتی ہے، کیونکہ زوال کے لئے قوم کے اعضاء و ارکان کا عملی اضطراب، کافی ہے، بلکہ اس کا ظہور کبھی کبھی فوری تباہی کی صورت میں ہوجاتا ہے، اس لئے ہر قوم مزاج عقلی کے استحکام کے لئے طویل زمانے کی محتاج ہوتی ہے، لیکن اس کو نہایت قلیل مدت میں کھو دیتی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمدنی ترقی کی منزل نہایت دور، اور اس کے زوال کا راستہ نہایت قریب ہے۔

(۱۵) اخلاق کے بعد تمدن پر سب سے زیادہ گہرا اثر اصول تمدن کا پڑتا ہے، لیکن ان کا عمل بتدریج شروع ہوتا ہے، یعنی وہ پہلے احساس بنتے ہیں، پھر نظام اخلاق کے اجزاء میں شامل ہوتے ہیں، اور اخیر میں مسلمات عامہ میں داخل ہوکر دائرہ بحث و تنقید سے نکل جاتے ہیں، ان مراحل کے طے کرنے کے بعد ان کا نظام عمل مکمل ہوجاتا ہے، ہر تمدن کا سنگ بنیاد یہی مسلم الثبوت اصول ہوتے ہیں، اور ان پر مدتوں میں زوال آتا ہے۔

ان اصول میں بھی اختلاف مدارج ہے، چنانچہ تمام اصولوں سے زیادہ تمدن پر مذہبی اصول کا اثر پڑتا ہے، اور تاریخ کے تمام عظیم الشان واقعات اختلاف مذاہب ہی کا نتیجہ ہے، اس لحاظ سے انسان کی تاریخ کا سلسلہ معبودوں کے تاریخی سلسلہ سے ملا ہوا ہے، ان معبودوں کو اگرچہ ہمارے ہی دماغ نے پیدا کیا ہے، تاہم ہماری زندگی پر ان کا بڑا اثر ہے، یہاں تک کہ صرف ان کے نام کے بدل دینے سے نظام عالم بدل جاتا ہے، ہر نئے معبود کا ظہور ہمیشہ نئے تمدن کا پیش خیمہ اور ان کا پردہ غیب میں چھپ جانا، ہمیشہ قدیم تمدن کے زوال کا مقدمۃ الجیش ثابت ہوا ہے۔

تخلیقات کی تاریخ اور سیاست پر مستند کتب

نادر شاہ	لارنس لاک ہارٹ	سلطان محمود غزنوی	پروفیسر محمد حبیب
میرے دوست میرے ساتھی	جی ایم سید	جنم جنم کی داستان	امرتا پریتم
تاریخ کیا سکھاتی ہے	ول ڈیورانٹ	ایمل کانسی	مجاہد حسین
بحرانوں کا دور	منیر احمد	پاکستان کے متنازعہ سیاستدان	مجاہد حسین
مولانا آزاد اور قوم پرست مسلمانوں کی سیاست	محمد فاروق قریشی		
عرب	ول ڈیورانٹ	پاکستان غلامی کے پچاس سال	ڈاکٹر فیروز احمد
انگریز راج اور پشتون سیاست	احمد سلیم	پاکستان تہذیب کا بحران	زبیر رانا
پاکستانی سیاست کے پچاس کردار	احمد سلیم	میراث	اندرا گاندھی
مشرق کے عظیم مفکر	ایوان پی۔مک۔گریل	پاکستان لوٹنے والے	مجاہد حسین
ایک غلام کی سرگزشت	سیتارام	تاریخ سندھ	مولانا سید ابو ظفر ندوی
مختصر تاریخ عالم	ایچ۔جی۔ویلز	پاکستان توڑنے والے	افتخار علی شیخ
پاکستان ٹوٹ جائے گا	منیر احمد	سو عظیم آدمی	مائیکل ہارٹ
آگرہ، اکبر اور اس کا دربار	سید محمد لطیف	تاریخ پنجاب	سید محمد لطیف
تاریخ لاہور	سید محمد لطیف	ہندی مسلم تہذیب	قاضی جاوید
ہند میں انگریز ریاست	پینڈرل مون	ہندوستان	ول ڈیورانٹ
بلوچ	ڈاکٹر شاہ محمد مری	احمد شاہ ابدالی	گنڈا سنگھ
تاریخ عالم پر ایک نظر	جواہر لال نہرو	تلاش ہند	جواہر لال نہرو
میری کہانی	جواہر لال نہرو	انسانی تمدن کی داستان	باری علیگ
پاکستان برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک	روش ندیم		
مہاراجہ رنجیت سنگھ	نریندر کرشن سنہا	گواہی	وسیم گوہر
شیر شاہ سوری اور اس کا عہد	کالکا رنجن قانون گو		
پاکستان --- قیام اور ابتدائی حالات	سری پرکاش	غلامی اور نسل پرستی	ڈاکٹر مبارک علی
Sindh Analyzed	ڈاکٹر مبارک علی	Story of The Fair Sex	راشد محمود لنگڑیال



اکرم آرکیڈ، ۲۹ ٹمپل روڈ (اصغاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۳